یا رب

غُلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان. ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا.کسی برگزیدہ ہستی کی نظرکا کرشمہ.ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ.

کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی.

ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر احبار کے گردآلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا.

ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا.

سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن.

آشقہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول.

یارب

غلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان۔ ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔کسی برگزیدہ ہستی کی نظرکا کرشمہ۔ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔

کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔

ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گردآلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔

ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا۔

سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن۔

آشفتہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول۔

''چاچو طٰہ کے کمرے میں کتابوں والی الماری'' ایک چھوٹے سے رقعے پر درج عبارت پڑھتے ہی اس کا سر تاسف سے دائیں بائیں ہلنے لگا۔

وہ مجھ سے (طٰہ عالم) سے فقط ایک بار ملی تھی اور اس پر لی ہی ملاقات کے بعد وہ میرے متعلق کیسا سوچتی ہوگی اس بات کا مجھے علم تھا اس کے ہاتھ میں موجود رقعہ ایک کھیل کا حصہ تھا۔ جو میرے بھتیجے رومی میاں کا ایجاد کردہ تھا۔

ایک غیر ملکی چینل اے ایکس این پر چلنے والے اپنے پسندیدہ کھیل ''منٹ ٹو ون اٹ'' کو رومی میاں نے اپنے انداز میں ''فائنڈ ٹو ون اٹ'' میں کچھ یوں ڈھالا تھا کہ پھر گھر کے مختلف حصوں میں چند رقعے چھپا رکھے تھے، کسی بھی ایک دفعہ کے مل جانے پر اس پر اگلے رقعے تک پہنچنے کے لیے اشارہ عبارتاً درج تھا۔ کم سے کم وقت میں سبھی رقعے کھوج لانے والا۔ اس کھیل کا فاتح ٹھہرتا لیکن وہ تاحال رقعہ ہاتھ میں تھامے جیسے تذبذب کا شکار کھڑی تھی اور میرے کمرے میں آنے سے کترا رہی تھی۔ جب وہ ایک دم سے چونکی۔ اس کی ٹیم کے ننھے منے کھلاڑی اسے بلند آواز میں پکار رہے تھے...... ''گو گو...... یومنہ آنٹی'' بچوں کو یوں پکارتا دیکھ کر لامحالہ اسے میرے کمرے تک آنا ہی پڑا۔ دروازے تک پہنچنے کے بعد اس نے کچھ سوچتے ہوئے جوتے باہر ہی اتار دیئے تھے اور ساتھ ہی دھیرے سے دروازہ کھول کر وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر پہنچتے ہی اس نے ایک طائرانہ سی نگاہ دوڑا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اب اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ میں اپنے کمرے میں نہیں ہوں اور اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایسی ہی دعائیں مانگ رہی تھی۔

کمرے میں کوئی کسی قسم کا برقی قمقمہ روشن نہ تھا۔ فقط مغربی سمت میں کھلنے والی کھڑکی سے سہ پہر کے اس حصے میں سورج کی کرنیں جیسے زینہ بنا کر اتر رہی تھیں۔ یوں وہ کمرے میں پھیلی اس ملگجی روشنی میں سر کو دروازے کی جانب گھما کر دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتے میرے پلنگ کے ساتھ پڑی

الماری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یکا یک جو میں نے ایک طویل سجدے سے اپنے سر کو اٹھایا تو وہ مجھ سے ٹکرا کر بامشکل گرتے گرتے سنبھلی اور بھونچکا سی ہو کر اپنے حلق سے نکلتی چیخ پر اس نے مشکل سے قابو پایا تھا' تو دوسری جانب مجھے بھی اس کا بنا دستک دیئے میرے کمرے میں چلے آنا معیوب لگ رہا تھا۔ میں متعجب سا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تو اب سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اشارتاً مجھ سے معذرت چاہی اور میں نے بھی اشارتاً ہی اس کی معذرت کو قبول کرلیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ چند لمحے پر لے رومی میاں بھی ایسے ہی انداز سے کمرے میں آئے تھے اور الماری میں کچھ چھوڑ کر الٹے پیروں لوٹ گئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے انگشت شہادت سے اس کی عقبی جانب اشارہ کیا' تو وہ میرا اشارہ پا کر وہ پلٹی' اس نے الماری میں پڑا رقعہ اٹھایا اور کاندھے سے کمر کی طرف گرہ لگے آنچل کو کھول کر سر پر اوڑھتے ہوئے جیسے داخل ہوئی تھی ویسے ہی دھیرے سے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بابا رب نواز کی دی کالی چادر کو ایک بار پھر سے کھول کر اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھا اور جائے نماز پر بیٹھتے ہی تسبیح ہاتھ میں لے کر آنکھیں موند لیں۔

اگلے روز فجر کی نماز سے فراغت پاتے ہی میں حسب معمول تسبیح ہاتھ میں لیے چھت پر آ گیا تھا۔ چھت پر آنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ صبح تڑکے چھت کا رخ کوئی بھی نہ کرتا تھا یوں مجھے تنہائی میسر آ جاتی تھی اور میں وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتا ہوا چند وظائف پڑھ لیا کرتا تھا۔ آج یونہی ٹہلتے ہوئے یکا یک میری نظر کسی کے سر پر پڑی کوئی نیچے لان میں جاگنگ کر رہا تھا لیکن گھر میں کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا جو یوں طلوع صبح اٹھ کر جاگنگ کرتا ہو تو پھر وہ کون تھی؟ سرعت سے میرے ذہن میں خیال آیا' میں یہ جاننے کے لیے متجسس انداز میں ذرا سا آگے کو جھکا یہاں چھت کہ اس حصے سے لان کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ میں وہاں سے ہٹنے کو ہی تھا جب وہ مجھے ٹریک سوٹ پہنے کانوں میں ہینڈ فری لگائے جاگنگ کرتی دکھائی دی اور میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر میں پہلا سا طہٰ عالم ہوتا تو یوں اسے جاگنگ کرتا دیکھ کر جھٹ سے اپنے کمرے میں پہنچ کر ٹریک سوٹ پہنتا اور لان میں پہنچ کر اسے خوب تنگ کرتا کہ وہ چڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

یومنہ میرے چچا مرزا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھی اور اس کی والدہ یعنی میری چچی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کا تعلق ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تھا۔ جب ان کے والدین رضائے الٰہی سے وفات پا گئے تو زمینوں کی دیکھ بھال کی خاطر چچا کو اپنے خاندان بھر کے ساتھ گاؤں جانا پڑا' تبھی سے وہ وہیں مقیم ہو کر رہ گئے تھے اور جب یومنہ کی بڑی بہن آمنہ کے رشتے کی بات مجھ سے بڑے بھائی غلام مصطفیٰ عالم کے لیے چلی تو ماں نے اس رشتے کو قبول کرتے سے صاف انکار کر دیا تھا پھر اس بات کو لے کر جو میرے چچا چچی خفا ہوئے تو اس بات کو بیتے بھی اب عرصہ ہو چکا تھا۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رنجش رفو ہو گئی تھی یا پھر کوئی مجبوری تھی جو انہیں یومنہ کو ہمارے ہاں بھیجنا پڑا تھا۔ وہ ماسٹر کر رہی تھی' اور چند روز ہی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں بتانے کے بعد وہ مستقل طور پر ہمارے گھر رہنے آ گئی تھی۔ پھر یہ بات مجھے

بعد میں معلوم پڑی تھی کہ درحقیقت بڑے ابا اسے ہاسٹل سے گھر لے آئے تھے اور میں یہ جاننے کے بعد سوچنے لگا کہ بزرگوں کی چھایا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے آج جو میں جیتا جاگتا اپنے پیروں پر چلنے پھرنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بھی بڑے ابا کا بڑا کردار شامل تھا۔ میرے لبوں پر صدا ان کے لیے دعائیں جاری رہتی تھیں، وہ مجھے اپنے ابا سے بھی بڑھ کر عزیز تھے اور جب بھی وہ بہت بیمار پڑ جاتے اور مجھے پاس بلا کر کہتے کہ ''طٰہٰ میاں اب ہمارے جانے کا وقت آ گیا ہے'' تو ان کی یہ بات سن کر میری آنکھیں یوں برس پڑتیں کہ ان کے ہاتھ بھیگ جاتے اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگتے کہ ''میاں تمہاری یہ محبت ہی ہمیں اس دنیا میں روکے ہوئے ہے'' اور میں بچوں کی طرح چلانے لگتا کہ بڑے ابا میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں اپنے بازو پھیلا کر انہیں یوں جکڑ لیتا کہ پاس موجود لوگوں کی آنکھیں بھی رقت جذبات سے بھیگنے لگتیں اور وہ بھی بڑے ابا سے میری محبت اور وابستگی کو دیکھ کر میری طرح ان کی لمبی عمر کے لیے دعائیں کرنے لگتے۔ مجھے یونہی خیالوں میں گم چھت پر ٹہلتے ہوئے آج کچھ زیادہ ہی وقت بیت گیا تھا۔ جب بابا عبدالقادر مجھے ڈھونڈتے چھت پر آ پہنچے تھے۔

''صاحب ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' وہ میرے پاس آ کر ہاتھ باندھے جب یوں مجھ سے مخاطب ہوتے تو مجھے ان پر بڑا پیار آتا تھا۔ انہیں میں یونہی ادب سے ہاتھ باندھے محبت سے بات کرتے دیکھتا تو سوچتا رب سوہنے نے ہم پر جو پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے تو اس میں بھی ہمارا ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے ہونا رب سوہنے کو کیسا پیارا لگتا ہوگا۔ اسے بھی ہم پر کس قدر پیار آتا ہوگا' ذات' پات' رنگ' نسل' امیری' غریبی' سندھی' پنجابی' بلوچی' پٹھان کسی بھی تفریق کے بغیر رب سوہنا سبھی کو اپنی رحمت کی چھایا میں لے لیتا ہوگا۔ جیسے آگے بڑھ کر میں نے اپنا ایک بازو بابا عبدالقادر کے کاندھوں کے گرد حائل کر دیا تھا اور اب میں ان کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

ہمارے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی بابا عبدالقادر رسوئی میں جا گھسے اور میں ہولے سے سلام کرنے کے بعد بڑے ابا کے ہاتھ پر بوسہ دے کر ان کی بغل میں ہی خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے شاید وہاں کچھ باتیں ہو رہی ہوں لیکن اب میرے وہاں پہنچنے پر مکمل طور پر خاموشی چھا چکی تھی۔ فقط رسوئی سے پانی کے گرنے اور برتنوں کے ٹکرانے کا شور سنائی دے رہا تھا' لیکن چند لمحے بعد ہی اس شور میں انسانی آوازوں کا اضافہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ جب یومنہ ہاتھوں میں چند کاغذات تھامے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو سبھی کو سلام کرنے کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ آج وہ پہلے روز ہمارے ساتھ ناشتے کی میز پر آئی تھی' وہ بچپن میں بھی ایک دو بار ہی ہماری طرف آئی ہوگی' اسی وجہ سے اب اس کے عرصہ دراز کے بعد ہمارے ہاں آنے پر ماں چند روز تک ناشتہ اور کھانا اس کے کمرے میں ہی بھجوا دیتی تھی' تاکہ چند روز میں وہ بھی سے جان پہچان بنا لے تو اسی بیچ اس کی جھجک بھی مٹ جائے گی۔ یوں آج وہ سبھی کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھی۔ اس کے آ جانے کے بعد میری نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ جب مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ یومنہ سے مخاطب تھی۔

''بیٹا اگر آپ پڑھنا چاہتی ہو تو ناشتا آپ کے کمرے میں ہی بھجوا دیں۔''

''ارے نہیں آنٹی دراصل آج کلاس میں پریذنٹیشن ہے' میں نے سوچا جب تک ناشتہ مکمل ہوگا چند پوائنٹس ذہن نشین ہوجائیں گے۔'' ماں کی بات سن کراس نے سرعت سے جواب دیا تو بڑے ابا اس کی بات مکمل ہوتے ہی سراہتے ہوئے بولے۔

''بھئی ہماری بیٹی تو بڑی ہونہار ہے۔'' یومنہ بڑے ابا کی بات سن کر شرماتے ہوئے مسکانے لگی اور میں بدستور ابھی تک چپ چاپ ہی بیٹھا تھا۔ جب ابا اس سے دریافت کررہے تھے۔

''بیٹا آپ کی پریذنٹیشن کا موضوع کیا ہے؟''

''جی انکل میرا موضوع ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ ہگ بوسون ہے' جس کا نام دو سائنس دانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا ہے۔ یہ ہگ اور بوسون کی حالیہ دریافت ہیں جس پر انہیں نوبل پرائز سے بھی نوازا گیا ہے۔'' ابا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یومنہ ہاتھ میں پکڑے صفحات کو بھی الٹا پلٹا کر دیکھتی رہی' ابا اس کے موضوع سے متعلق جان کر اسے سراہے بنا نہ رہ سکے تو ماں یوں خاموش رہی جیسے ان کے پلے کوئی بات ہی نہ پڑی ہو وہ فقط ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک جو انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تو جیسے اب ان کے چہرے سے مسکان غائب ہوچکی تھی اور میں نے بھی جو ایک لمحہ بھر کو نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تھا تو فوراً ہی اپنی نگاہیں واپس جھکالی تھیں۔ میں نے اس وقت بھی بابا رب نواز کی کالی چادر کو اوڑھ رکھا تھا اور سر کو قدرے خم دیئے سبھی کی باتیں سن رہا تھا کہ یکا یک یومنہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''طٰہ سنا ہے آپ یونیورسٹی کے دنوں میں بڑے اچھے مقرر رہ چکے ہیں۔ آپ میری پریذنٹیشن میں کچھ ہیلپ کریں ناں۔'' وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور جواب طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی لیکن اس کی بات ختم ہونے تک میری کیفیت ہی بدل چکی تھی۔ مجھ پر رعشہ سا طاری ہوچکا تھا۔ میں اپنی سیمابی کیفیت پر قابو پانے کی کشمکش میں مبتلا تھا' میرا وجود مجھے سرد ہوتا محسوس ہورہا تھا لیکن ساتھ ہی اپنی ہتھیلیوں اور پیشانی پر پسینے کی موجودگی کو بھی میں محسوس کرسکتا تھا پھر ایک جھماکا سا ہوا اور میرے چار سو منظر بدلنے لگا۔ چار سو چلتی خوفناک آندھی......اسپیکروں سے نکلتی پھٹی پھٹی آوازیں ...... انسانوں کے انبوہ سے بلند ہوتا نعروں کا شور......اور تاریک آندھی میں اڑتے اخبارات کے صفحات اب مجھے واضح دکھائی دے رہے تھے' پھر یکا یک ہوا میں اڑتے ان صفحات میں سے ایک خون آلود صفحہ میرے چہرے سے آ چپکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں حواس باختہ ہوکر اپنے ہاتھ اٹھائے چہرے سے چپکے خون آلود اخبار کو ہٹانے کی کوشش میں چیخنے لگتا' میرے قریب بیٹھے بڑے ابا میری دگرگوں ہوتی کیفیت کو بھانپ چکے تھے۔ وہ چند لمحوں تک میری طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کرتے رہے لیکن انہوں نے جب مجھے ہر طرح سے بے بس پایا تو مجھے کاندھوں سے تھامے اٹھایا اور میں ان کے ہمراہ منوں بھاری ہوتے وجود کے ساتھ رینگتا ہوا چلنے لگا۔ ماں اور ابا آزردگی سے سر کو جھکائے وہیں بیٹھے رہے۔ جبکہ یومنہ کی متعجب نگاہیں سوال بنی دیر تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔



بڑے ابا مجھے لے کر ڈائننگ ہال سے میرے کمرے میں آئے تھے' لیکن تاحال میں سیمابی کیفیت میں مبتلا گم صم سا تھا اور بڑے ابا بھی فقط

اشاروں کنایوں میں ہی اپنی بات سمجھاتے رہے تھے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ میرے ذہن میں چلتی اتھل پتھل اگر رک سکتی تھی تو ایک ہی صورت میں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اسی مقصد سے وہ مجھے آرام کرسی پر بیٹھا کر وہاں سے جا چکے تھے۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی میرے ذہن کے سلولائیڈ پر پھر سے ڈائننگ ہال کا منظر چلنے لگا تھا۔ یکا یک جو یومنہ نے مجھے مخاطب کیا تو گویا میری روح تک کو ہی جھنجوڑ ڈالا تھا۔

اس سے پہلے کہ ایک بار پھر سے میں ویسی ہی کیفیت کا شکار ہونے لگتا' میں سبھی قسم کے خیالات کو جھٹک کر سوچنے لگا کہ میں اس کی پریذنٹیشن میں کیا مدد کر سکتا ہوں' اس کے بقول کہ آج ہی اس کی پریذنٹیشن ہے اور اس نے جو موضوع بتایا تھا وہ کسی نئے دریافت ہونے والے ذرے کی بات کر رہی تھی جس کا نام دو سائنسدانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا تھا یعنی کہ اس کا موضوع ہگ بوسون ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ تھا۔ یہ نئی دریافت اور اس کے سائنس دان دونوں ہی میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ معلومات ہی سہی یہ سوچ کر میں نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور سرچ انجن میں ہگ بوسون لکھ کر جوانٹر کا بٹن دبایا تو سرعت سے اس موضوع سے متعلقہ بہت سے صفحات میرے سامنے کھل چکے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے میں ان صفحات کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔

دنیائے سائنس کس قدر ترقی یافتہ ہو چکی تھی اور پھر اسی ترقی یافتہ دنیا کے دو بڑے سائنس دان ہگ اور بوسون خود دنیا کو بتا رہے تھے کہ ''یس'' ''آئی ایم دابلیور'' وہ اس نئے دریافت ہونے والے ذرے کے لیے منعقد ہونے والی اس عظیم وعالیشان تقریب میں جہاں دنیا جہاں سے آئے سینکڑوں اعلیٰ دماغ موجود تھے۔ جن میں ہر مذہب رنگ ونسل سے تعلق رکھنے والے افراد جمع تھے۔ وہ انہی کے سامنے بے ساختہ اپنے ہاتھ اٹھائے خوشی سے سرشار ہو کر بتا رہے تھے کہ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ خدا ہے' کوئی ہے' جس کے دم سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے' کسی اعلیٰ وارفع واحد ویکتا ہستی کا وجود ہے جو کائنات کے ذرے ذرے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مجھے یومنہ کا چنا یہ موضوع بے حد پسند آیا' جوں جوں میں مطالعہ کرتا چلا گیا۔ مجھے اس نئی دریافت سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی چلی گئیں پھر ایک دم سے مجھے دہریہ قسم کے لوگوں کا خیال آنے لگا جو سرے سے ہی خدا تعالیٰ کے وجود سے منکر ہیں' میں اپنی اب تک کی زندگی میں کسی ایسے شخص سے نہ ملا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ اگر زندگی نے وفا کی اور کبھی ایسا کوئی شخص زندگی میں ملا تو اسے یہ ضرور کہوں گا کہ تم جیسے لوگ جو خدا تعالیٰ کے وجود کو نہیں مانتے' اس کے بھیجے نبیوں کو بھلا کیسے مانو گے' ان پر نازل کردہ مصحف کا بھلا کیونکر مطالعہ کرو گے لیکن آج سائنس بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے جس حقیقت سے تم لوگ نظریں چرا رہے ہو۔ یہ تمہی لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

ایسے ہی خیالوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے آواز دی تو یہ بابا عبدالقادر تھے۔ وہ دوا والی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

''صاحب دوا لے لیجیے۔'' انہوں نے ٹرے کو میز پر رکھتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔ میں دوا کھا لوں گا میں نے فقط انہیں اشارتاً ہی جواب دیا۔ جسے سمجھ لینے کے باوجود وہ وہی کھڑے رہے پھر

میرے مزید کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بولے۔

''بڑے صاحب کا پیغام ہے میں آپ کو دوا کھلا کر ہی کمرے سے باہر آؤں۔'' اور میں ان کی بات سنتے ہی سوچنے لگا کہ ایک بڑے ابا کے سوا اور بھی تو گھر میں اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جب بابا عبدالقادر نے پانی بھرا گلاس میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے دوا کھالی تو وہ دوا والی ٹرے اٹھا کر پھر کمرے سے چلے گئے تھے۔

دوپہر کھانے کے بعد میں ذرا استراحت کو لیٹ گیا تھا اور جو عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر آیا تھا تو میرا مقصد فقط بڑے ابا کے کمرے میں جا کر ان کا حال دریافت کرنا تھا۔ اب اس عمر میں وہ غذا سے زیادہ دوا سے ہی چل رہے تھے۔ پھر میں ان کے کمرے تک پہنچنے ہی والا تھا جب یکایک مجھے اپنے ہاتھ کے ساتھ کسی ننھے سے ہاتھ کے چھونے کا احساس ہوا اور جو میں نے سر گھما کر دیکھا تو یہ رومی میاں تھے۔ میں نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا تو مجھے ان سے معلوم پڑا کہ وہ میرے لیے کسی کا پیغام لائے تھے اور وہ یومنہ تھی۔ جو اس وقت لان میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

رومی میاں کے کاندھے پر ہلکی سی تھپکی لگا کر میں نے کہا کہ انہیں بولنا وہ تھوڑی دیر میں آرہے ہیں اور میں بڑے ابا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ ان کے کمرے میں پہنچ کر مجھے معلوم پڑا کہ وہ اپنے کمرے میں ہی نہ تھے اور یوں اب میں لان کی جانب بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ عمر کے اس حصے میں بھی آرام سے کہاں بیٹھنے والے تھے۔ لازماً کسی کا کوئی مسئلہ سلجھانے گئے ہوں گے یا کسی کی مالی اعانت کو پہنچے ہوں گے۔ ان میں اور میرے ابا میں یہی ایک بڑا فرق تھا۔ میرے ابا ٹھہرے آج کی دنیا کے مادہ پرست انسان' آج وہ جس بھی مقام پر تھے وہ سارا مقام و مرتبہ بڑے ابا کی بدولت ہی تو تھا۔ انہوں نے جو اپنی زندگی کے کئی برس بنا کسی لالچ و طمع کے انسانیت کی بھلائی میں صرف کیے تھے۔ میرے ابا آج ان برسوں کا حساب دولت سمیٹ کر چکا رہے تھے۔ کبھی میں بھی ابا کے ساتھ ان کی دولت سمیت سیاست کا ایک اہم حصہ تھا لیکن آج مجھے ایک ایم این اے کا بیٹا ہونے پر کوئی فخر محسوس نہ ہوتا تھا۔ آج اگر گھر میں میری کوئی پسندیدہ شخصیت تھے تو وہ بڑے ابا ہی تھے۔ یونہی سوچتے ہوئے میں لان میں لگی کرسیوں تک پہنچ چکا تھا۔ یومنہ مجھے دور سے ہی اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تو پاس پہنچ کر میں نے سلام میں پہل کی اور اسے کھڑا دیکھ کر خود بھی بیٹھتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر ایک نظر میں ہی اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے اس روز ڈائننگ ہال میں مجھ پر طاری ہو جانے والی عجیب کیفیت کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایسے بہت سے سوال اٹھ رہے تھے جس کے جواب وہ مجھ سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب ہمارے گھر کے ایک اہم فرد کی طرح تھی۔ اگر وہ مجھ سے کچھ جاننا بھی چاہتی تو مجھے اسے کچھ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ ہوتا' لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ابھی اسے ہمارے ہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو یوں میں اس کے سامنے اپنی زبوں حالی کی روداد کھول کر بیٹھ جاؤں۔ ''آج آپ کی پریذنٹیشن کیسی رہی۔'' اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتی میں نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

''جی...... دراصل میری باری آنے تک پیریڈ

ٹائم آف ہو گیا تھا' یوں اب میری پریذنٹیشن کل ہوگی۔'' اس نے ایک دم سے چونک کر جواب دیا۔ گویا وہ کسی گہری سوچ میں محو تھی۔ اسے پھر سے خاموش پاکر میں بولا۔

''اب اگر آپ کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بولیے گا۔'' وہ میری یہ بات سن کر مسکائی اور کہنے لگی کہ اس نے رومی کو میرے پاس اسی مقصد سے بھیجا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنی تیاری سے متعلق آگاہ کرنے لگی۔ اسے سننے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی اچھے ذہن کی مالک تھی۔ وہ ہگ بوسون کے اس نئے دریافت ہونے والے ذرے اور اس کی ساخت کو طبعی یا حسابی انداز میں کلیے سے بڑی مہارت سے بیان کر سکتی تھی۔ اس کی تیاری ایک اعلیٰ پریذنٹیشن کے لیے کافی تھیں۔ وہ بول چکی تھی' اب میری باری تھی۔ میں نے فقط اس کی معلومات کی ترتیب کو درست کیا۔ اسے بتایا کہ وہ پریذنٹیشن کا آغاز وہاں سے کرے جب ایک عظیم و عالیشان تقریب کے دوران ہگ اور بوسون ہر رنگ و نسل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سامنے بے ساختہ پکار اٹھے تھے۔ ''یس آئی ایم دا ہلیبوز'' ایسا کہتے ہوئے میں اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے سن کر جہاں اسے میری کوئی بات مفید لگتی' وہ اپنے پاس رکھی نوٹ بک میں اسے درج کر لیتی تھی اور جونہی میری بات مکمل ہوئی تو اب وہ مجھے کچھ الگ ہی انداز سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے استفسار پر کہ مجھے یہ سبھی معلومات کیسے حاصل ہوئیں۔ میں نے اسے آج اپنی سوچ کے حوالے سے آگاہ کیا تو ہمیں وہاں بیٹھے وقت کے بیتنے کا جیسے احساس ہی نہ ہوا تھا' اب سورج غروب ہونے کو ہی تھا۔ میرے یومنہ کے ساتھ آ کر بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ تھا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں آئے گا۔ بڑے ابا تو دور کی بات بھابی' بچوں تک کو میرے قریب نہ آنے دیتی تھی۔ رومی میاں ابھی دو ماہ کے ہی تھے جب میری طبیعت بگڑ گئی تھی' اور جب میری حالت سنبھلی اور میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ذرا سمجھنے کے قابل ہوا تو رومی میاں بڑے ہو چکے تھے اور پھر صائم میاں جو دنیا میں آئے تو میرا کتنا جی چاہتا کہ میں انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھاؤں' جب وہ اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے میری جانب بڑھتے تو اسے گرنے سے پہلے ہی اٹھا کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں۔ اوپر ہوا میں جو اچھالوں تو اس کے معصوم قہقہے میرے کانوں میں کیسا سرور بھر دیں اور جو وہ اپنے دودھ کے دانتوں سے میرے ہاتھوں پر کاٹے تو میں اس میٹھے درد کے احساس کو محسوس کرنا چاہتا تھا لیکن بھابی کیا سمجھتی میرے ایسے جذبات کو' ان کے نزدیک تو میں ایک خبطی' جنونی انسان تھا جو کسی بھی لمحے ان کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ''اشھد ان لا الہ الا اللہ'' ایک دم سے میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا' مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی اور یومنہ بھی مجھ سے اجازت لے کر جا چکی تھی۔ میں جھٹ سے اٹھا وضو تو تھا ہی وہیں سے سیدھا مسجد کی جانب چل پڑا۔

گھر سے مسجد تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ شامل ہونے کے لیے مجھے اذان کہ شروع ہونے سے ذرا پہلے گھر سے چلنا ہوتا تھا اور اب میرے گھر سے نکلنے تک موذن نصف سے زیادہ اذان کہہ چکا تھا۔ یوں میرے مسجد میں پہنچنے تک جماعت کھڑی ہو چکی تھی لیکن مجھے پہلی ہی رکعت میں جا ملنے کا موقع مل گیا تھا۔ فرض نماز کی ادائیگی کے بعد سنتیں اور نوافل ادا کر کے میں رب سوہنے کے برستے نور و انوار میں بھیگنے کے لیے وہیں بیٹھا

رہا۔ بسا اوقات مسجد میں یونہی بیٹھے ہوئے مجھے وہی پہلے ساطٰہ عالم یاد آنے لگتا اور ساتھ ہی مجھے وہ نماز یاد آنے لگتی تھی جو ایک بار میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ادا کی تھی۔

ایک روز جو ہم دوستوں کا گروپ یونیورسٹی سے نکلا تو ہمیں ہر سمت سے اذان کی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں۔ اس روز ہمارے ساتھ ایک نیا لڑکا اعظم بھی تھا۔ وہ جو نماز پڑھنے کا عادی تھا' تو اس روز اس نے ہمیں بھی مسجد چل کر نماز ادا کرنے کی دعوت دی۔ اس کی دعوت پر جو میرے دوست مسجد کی جانب بڑھے تو لامحالا مجھے بھی ان کے ساتھ چلنا پڑا تھا۔ وگرنہ میں تو کبھی عید کی نماز ادا کرنے کسی عید گاہ تک بھی نہ گیا تھا۔ میری اس روز ادا کی نماز کی حرکات وسکنات کچھ یوں تھیں جیسے کسی نے چلتی وڈیو کو چار گنا کے حساب سے فارورڈ پر چلا دیا ہو۔ دوسروں کے دو رکعت ادا کرنے تک میں باہر کھڑا اپنے دوستوں کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا اور آج مجھے کیسا سرور ملتا تھا' نماز میں ایک ایک رکعت کو ادا کرنے میں۔ یہی سوچ کر بے ساختہ میرے لب پر ادا ہونے لگا تھا کہ وہی ستار عیوب ہے جو ہماری برائیوں کو اچھائیوں سے بدلتا ہے پھر میں مسجد سے جو باہر نکلا تو میرے دل کی طرح باہر کا موسم بھی بدل چکا تھا۔ گھٹا نے جو برس کر رم جھم سی لگا رکھی تھی تو ساتھ ہی سنسناتی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ اس برستی پھوار اور رم جھم میں' میں گھر پہنچنے تک کوئی بھیگنے والا نہ تھا' ایسا سوچتے ہوئے میں نے جیسے ہی اپنا پہلا قدم آگے بڑھایا تو تیز ہوا کے جھونکے سے اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھی چادر کو میں نے بامشکل کھلنے سے روکا تھا لیکن میں ٹھہرا نہیں اور اب راستہ بھر میں سوچتا چلا جا رہا تھا کہ بابا رب نواز کی دی یہ چادر کیسا طلسماتی چولا ثابت ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے میرے جسم کو حرارت پہنچا کر میری روح تک کو گرما دیا تھا اور اب چل رہی یخ بستہ ہواؤں کے سامنے بھی ڈھال ثابت ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ بابا رب نواز نے ہدایت کی تھی۔ ''کہ میاں جب اچھے ہو جاؤ تو اسی جگہ آ کر مجھے یہ چادر لوٹا جانا۔'' ایسا یاد آتے ہی میں نے ارادہ کر لیا کہ جواب بڑے ابا ملیں گے تو میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ پھر اوڑھی ہوئی چادر پر جو نمی تھی' اسے میں نے جھاڑ کر ایک طرف پھیلا دیا تھا اور بستر پر جو ذرا سی دیر آرام کرنے کو لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ میں نے آواز دی تو بابا عبدالقادر دوا والی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ انہیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب وہ مجھے دوا کھلائے بغیر کمرے سے نکلنے والے نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پھر کسی بھی حجت کے بغیر میں نے دوا کھا لی تھی۔

اگلے روز ناشتے کی میز پر یومنہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی موجود تھی اور میرے وہاں بیٹھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا دیر نہ لگی تھی کہ میرے پہنچنے سے پہلے وہاں میری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ یومنہ اپنی پریذنٹیشن کے لیے مجھ سے حاصل ہوئی معلومات سے سبھی کو آگاہ کر چکی تھی۔ پھر ناشتہ کرتے ہوئے وہ یکا یک مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''طٰہٰ آج آپ میرے ساتھ یونیورسٹی چل سکتے ہیں؟'' اس کی بات سن کر فقط میں ہی نہیں باقی لوگوں نے بھی ناشتہ چھوڑ کر یوں حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو میں کیا کوئی جواب

دیتا' بڑے ابا فوراً ہی قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

''بھئی کیوں نہیں جائے گا۔'' پھر وہ میری جانب مسکا کر دیکھتے ہوئے بولے۔ ''طٰہٰ میاں ذرا آج اپنے خاص وقت میں سے کچھ وقت یومنہ بیٹی کے لیے بھی نکال کر اس کی یونیورسٹی چلے جانا۔'' اب کی بار جو بڑے ابا بھی اس کے ہم آواز ہو کر بول پڑے تو پھر میں بھلا ان کی کسی بھی بات کو رد کرنے سے متعلق سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ یوں میں نے مختصر سا جواب دے کر ہامی بھر لی تھی اور میرے ماں اور ابا یوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے جیسے آج کوئی ان ہونی ہو گئی ہو۔ ماں نے جواب کی بار میری جانب دیکھا تو وہاں مجھے ممتا کی وہی پیاسی جھلک دکھائی دی۔

مجھے احساس تھا کہ میری ذات سے جڑے ان کے کتنے ارمان تھے' اگر وہ مجھ سے خفا تھے تو یہ بھی ظاہراً ہی تھا۔ میں نے کبھی ان کی بات جو نہ مانی تھی۔ آخر کو تھے تو ماں باپ ہی۔ چاہے میرے ان سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں وہ مجھ سے کتنا ہی خفا کیوں نہ ہوں' لیکن اس رشتے کی عظمت ان سب باتوں سے بڑی تھی۔

ڈائننگ ہال سے اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ میں نے یومنہ کے ساتھ اس کی یونیورسٹی چلنے کے لیے ہامی کیوں بھر لی تھی؟ لیکن بات تو وہاں سے شروع ہوئی تھی جب یومنہ نے مجھ سے اپنی پریذنٹیشن کے لیے مدد چاہی تھی اگر میں اسی روز انکار کر دیتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔

میں جو کہ عرصہ دراز سے ایک تنہائی سی تنہائی کا شکار تھا' تو یہ میرے اردگرد جیسے کوئی مکڑی کا سا جالا بن چکی تھی۔ مجھے اس تنہائی سے پیچھا چھڑانا دشوار معلوم ہوتا تھا' اسی لیے گھر میں یا خاندان بھر کی کسی بھی تقریب میں' میں جانے سے کتراتا تھا۔ بسا اوقات گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں' میں بھولے سے پہنچ جاتا تو پھر بھی کو میرا وجود وہاں گراں گزرتا۔ وہ اب اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ میں کسی بھی قسم کی زندگی کی پہلی سی رعنائیوں کا حصہ نہیں بننا چاہتا' یوں وہ مجھے کسی قسم کی مصروفیت سے آگاہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور جو کبھی میں ان جانے میں گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں اچانک سے جا پہنچتا تو مجھے وہاں پا کر جو ان کا عزو وقار مجروح ہونے لگتا تو پھر وہ چاہتے کہ میں جلد سے جلد وہاں سے ہٹ جاؤں۔ اس بات کا مجھے خود بھی احساس ہوتا اور میں وہاں سے ہٹنے میں ذرا وقت نہ لگاتا۔

ابھی اپنے کمرے میں پہنچ کر میں ایسی ہی کشمکش کا شکار تھا کہ یارب جیسا میں نے حلیہ بنا رکھا ہے' اسی حلیے میں' میں اس کے ساتھ چلوں گا تو وہ کیسا محسوس کرے گی۔ یونیورسٹی میں اس کی کلاس میٹس بھی ہوں گی وہ لازماً مجھے ان سے بھی ملوائے گی' تو یوں وہاں اس کا امیج خراب ہو گا اور میں بھلا ایسا کیونکر چاہوں گا۔

ایسا ہی سوچ کر آج عرصہ دراز کے بعد میں ان بند کبرڈ کے پٹ کھولے جہاں وہ سارے ملبوسات میرا انتظار کر رہے تھے جو ماں' ابا اور بھائی میری گزری ہر سالگرہ پر مجھے تحفتاً دیتے آئے تھے' لیکن میں نے ان کو استعمال کرنا تو دور کی بات کبھی ٹھیک سے دیکھا تک بھی نہ تھا پھر جس سوٹ پر آ کر میرا ہاتھ رک گیا تھا' وہ فقط ایک ہی شخص مجھے گفٹ کر سکتا تھا' اور وہ جی ایم تھے۔ بڑے بھائی غلام مصطفیٰ کو میں جی ایم ہی کہہ کر پکارا کرتا تھا' جی ایم میری پسند نہ پسند سے اس قدر واقف تھے کہ بارہا یوں ہوتا کہ وہ اپنے لیے لایا سوٹ بھی مجھے دے

دیتے کہ میرے تن پر آتے ہی وہ کچھ یوں جچنے لگتا تھا یایوں کہہ لیں کہ ہم دو بھائیوں میں جو چیز مشترک تھی وہ لباس کی پسندیدگی ہی تھی۔

پھر لباس تبدیل کرنے کے بعد جو ایک اور کام میں نے کیا وہ بابا رب نواز کی دی چادر تھی جسے میں نے رات خشک ہونے کے لیے پھیلایا تھا اور اب ایک بار پھر سے جھاڑ کر تہہ لگا کر اسے اپنے بستر پر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد میں ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا' بال تو خاصے بڑھ چکے تھے اور داڑھی تو میں باقاعدہ رکھ چکا تھا۔ اپنے شانوں تک دراز بال دیکھ کر مجھے کالج کا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔ جب ایسے ہی بال بڑھائے میں پونی کیا کرتا تھا۔ پھر یکا یک جو میری نظر گھڑی پر پڑی تو میں نے مزید کمرے میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے سے نکل کر جو میں پورچ میں پہنچا تو مائیکل ہمارا ڈرائیور مجھے دیکھ کر جیسے دنگ رہ گیا۔ میں اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ تو وہ خوشی سے کیسا سرشار بے قابو ہو کر میری جانب بڑھا چلا آیا تھا پھر میرے قریب پہنچ کر بے ساختہ اس نے مجھے اپنے گلے سے لگالیا تھا اور جب یومنہ اپنے ہاتھوں میں ایک بڑی فائل اور چند ایک کتابیں اٹھائے پورچ میں پہنچی تو ایسی ہی کچھ ملتی جلتی حالت اس کی بھی ہو رہی تھی۔ اس نے آج پہلی بار مجھے کالی چادر کے بغیر دیکھا تھا۔ جسے میں ہمہ وقت اوڑھے رکھتا تھا۔ ان سب کے علاوہ کوئی اور بھی تھا جو مجھے دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور بھی تھا جو آج برسوں بعد مجھے زندگی کی پہلی سی رعنائیوں میں واپس پلٹتا دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ماں اور ابا اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے پاس کھڑے جہاں سے پورچ کا سارا منظر واضح دکھائی پڑتا تھا مجھے دیکھ رہے تھے اور اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں یہ جاننے کے باوجود بھی نہ پلٹا اور میں نے اس کھڑکی کی جانب نہ دیکھا جہاں وہ کھڑے مجھ پر نہال ہو رہے تھے۔

یومنہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ میں بھی آگے بڑھ کر مائیکل کے مقابل سیٹ پر بیٹھا تو میرے بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ رم جھم سے شروع ہونے والی بارش رات گئے تک موسلا دھار ہو کر برستی رہی تھی جس کے اثرات ابھی تک جگہ جگہ کھڑے پانی کی صورت میں باقی تھے اور آسمان پر بادل اب بھی کہیں کہیں ٹولیوں کی شکل میں تیرتے دکھائی پڑ رہے تھے۔ پھر جب بھی انہی بادلوں کی کوئی مست ٹولی سورج کے سامنے آکر اس کی کرنوں کو ڈھانپ لیتی تو کہیں دھوپ تو کہیں چھاؤں کا سا منظر دکھائی دیتا۔

ہماری گاڑی سروس روڈ سے نکل کر اب شہر کی ایک اہم مصروف ترین شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے بیچ بیچ لگے برقی کھمبے جن پر موجود قمقمے رات کو روشن کر دیئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ لٹک رہے فلیکس ابا کی الیکشن کے دنوں چلائی سیاسی مہم کی یاد دلا رہے تھے۔ کبھی ان پر ابا کے ہمراہ میری تصاویر بھی آویزاں ہوتی تھیں لیکن آج میں خود ان کی کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں کا حصہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

اب ہم یونیورسٹی پہنچنے والے تھے۔ یونیورسٹی گھر سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم یونیورسٹی جا پہنچے تو مائیکل نے گاڑی پارکنگ ایریا میں جا روکی۔ میں اور یومنہ گاڑی سے اترتے ہی یونیورسٹی کی اندرونی عمارت کی جانب بڑھ چکے تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے اب مجھے کئی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں اور یومنہ مجھے وہیں سے الگ الگ شعبوں سے متعلقہ عمارتوں کا تعارف اشاروں سے کروا رہی تھی۔

کچھ ہی پل میں ہم اس عمارت تک پہنچ گئے تھے جس کے آڈیٹوریم میں یومنہ کی پریذنٹیشن ہونا تھی۔ ہال میں داخل ہونے سے ذرا پہلے میں نے اسے کہا کہ میں اس کے ساتھ آ ہی گیا ہوں تو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ ایسا میں نے فقط اس مقصد سے کہا تھا تاکہ وہ اطمینان سے اپنی پریذنٹیشن دے سکے اور جب اس کی کلاس مکمل ہو تو ہم پھر لوٹیں' وہ میری یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوئی کہ پھر جھٹ سے بولی۔

''طٰہٰ آپ سے میری چند کلاس فیلو بھی ملنا چاہتی ہیں۔'' اس کی بات سن کر مجھے لگا جو بات اس نے پریذنٹیشن مکمل ہونے کے بعد کہنا تھی وہ پہلے ہی کہہ دی تھی۔ میں فقط اس کی بات کے جواب میں مسکرا دیا۔ اب ہم آڈیٹوریم ہال میں پہنچ چکے تھے اور میں پچھلی کسی نشست پر جا بیٹھا تھا' جب کچھ دیر میں پریذنٹیشن کا آغاز ہوا تو پہلی باری یومنہ کی ہی تھی۔ اس نے بگ بوسون تھیوری کا تعارف کروانا شروع کیا تو اس کا موضوع ہی کچھ اس قدر دلچسپ تھا کہ سارے ہال پر جیسے گہرا سکوت طاری ہو گیا اور میری دی معلومات سے بھی اس نے بھرپور استفادہ حاصل کیا تھا۔ وہ پُراعتماد انداز میں اپنی پریذنٹیشن مکمل کرنے کے بعد واپس اپنی نشست پر جا بیٹھی تھی اور یونہی جب ایک' دو اور لڑکیوں نے بھی اپنی پریذنٹیشن مکمل کر لی تو وہ میرے پاس آئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کہیں میں بوریت تو محسوس نہیں کرنے لگا۔ اس کی یہ بات سن کر پہلے تو میں نے اسے خوش دلی سے سراہتے ہوئے بہترین پریذنٹیشن دینے پر داد دی اور پھر اسے کہا کہ اس کی پریذنٹیشن میں نے دیکھ لی ہے اب اگر پیریڈ ختم ہونے تک میں اسے یہاں بیٹھا نہ ملوں تو میں ہال سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں گا۔ وہ میری بات سن کر چلی گئی تو چند لمحوں تک وہی بیٹھے رہنے کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ امتحانات کے دن ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی تقریباً سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں کھڑے رہ کر مجھے اپنے یونیورسٹی کے دن یاد آنے لگے تھے۔ میں اچھے ذہن کا مالک تھا' لیکن میری سرگرمیاں اچھی نہ تھیں۔ اگر میں بھی اپنی تعلیم کو سنجیدہ لے کر چلا ہوتا تو اگر آج جی۔ ایم کی طرح پی ایچ ڈی نہ بھی ہوتا تو کم سے کم انجینئر یا وکیل تو ضرور ہوتا۔

جب وقت گزر جاتا ہے تو ہم اسے مقدر میں ہی نہ لکھے ہونے کا راگ الاپتے پھرتے ہیں۔ سارا خطاوار اپنے مقدر کو گردانتے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہم پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ ہم اس خاص وقت کی قدر و اہمیت کو کس حد تک سنجیدہ لیتے ہیں۔ ہم جانتے بوجھتے اس وقت کو بے دریغ غیر معیاری سرگرمیوں میں لٹا دیتے ہیں اور جب وقت اپنی دھیمی دھیمی رفتار سے گزرتا چلا جاتا ہے تو ماضی ایک پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی ہی سوچوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب مجھے اپنے عقب سے میٹھی چہکاریاں سی سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یومنہ اپنی کلاس میٹس کے ساتھ ہال سے باہر آ چکی ہے اور اب وہ میری طرف ہی آ رہی ہیں' لیکن یہ جاننے کے باوجود بھی میں پلٹا نہیں' پھر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا' ہاتھ کی جانب دیکھتے ہوئے جو میں پلٹا تو یہ یومنہ تھی۔ اس کا میری جانب بڑھا ہوا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً مجھے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا پڑا اور ساتھ ہی میری نظر پاس کھڑی تین اور لڑکیوں پر پڑی۔ میرا ہاتھ ابھی تک یومنہ کے ہاتھ میں ہی تھا۔ جب وہ سرعت

سے بولی۔

''مجھے پریڈنٹیشن میں بہت اچھے مارکس ملے ہیں۔ آئی ایم رئیلی تھینک فل ٹو یوطہ۔''

اس کی بات سن کر مجھے بہت اچھا لگا اور میں سوچنے لگا کہ ساری محنت تو اس کی اپنی ہی تھی پھر وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے جدا کرتے ہوئے مجھے اپنی کلاس میٹس سے ملوانے لگی۔ جانے وہ انہیں میرے متعلق کیا کچھ بتاتی رہی تھی کہ ان کی باتوں سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی برگزیدہ ہستی ہوں، جس کی زبان سے ادا ہوئی ہر بات اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو اور ساتھ ہی مجھے لگنے لگا کہ ہم لوگ کتنے ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ بڑھی ہوئی داڑھیاں، لمبی زلفیں اور چہرے پر دکھائی دیتا نور ہی ہمارے نزدیک پہنچے ہوئے لوگوں کی علامتیں بن چکی ہیں۔

پھر باتوں باتوں میں ہی ہم پارکنگ تک پہنچ چکے تھے۔ یومنہ نے اپنی دوستوں کو الوداع کہا اور ہمارے گاڑی میں بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی پھر جب تک ہم گھر پہنچتے عصر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں یوں گھر سے قریب ہی واقع مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے مائیکل کو روکنے کو کہا اور میرے گاڑی سے اترتے ہی مسجد کی جانب بڑھنے تک مائیکل گاڑی لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔



مسجد میں نماز ادا کر کے میں گھر پہنچا تو گھر کے خاص دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے ایک طرف سے بچوں کا شور سنائی دیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو یومنہ بچوں کے ساتھ لان میں بیڈمنٹن کھیل رہی تھی۔ میرے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا لیکن میں رکا نہیں بلکہ اسے نظرانداز کیے آگے بڑھ چکا تھا۔ ابھی میں نے چند قدم ہی آگے بڑھائے ہوں گے کہ جب مجھے اپنے عقب سے یومنہ کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر مجھے رکنا پڑا اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بچوں کے ساتھ ریکٹ ہاتھ میں تھامے جوشیلے انداز میں میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی پھر میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کچھ دور سے ہی ریکٹ میری جانب اچھال دی۔

''طہ کیچ اٹ اینڈ.....'' اور باقی کے چند الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی دب گئے تھے۔ میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہ تھا اور نہ ہی اس کے ہوا میں اچھالے ریکٹ کو میں نے آگے بڑھ کر تھامنے کی کوشش کی تھی۔ اسے مہمان سمجھ کر اب تک جو میں نے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا تو وہ یوں مجھ سے بے تکلف ہو رہی تھی مجھے اس کی بیڈمینٹن کھیلنے کی آفر پر سخت غصہ آ رہا تھا اسی لیے میں مزید وہاں اک لمحے کو بھی نہ ٹھہر سکا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میرا ایسا رویہ دیکھ کر جیسے یکا یک اس کے چہرے پر بھی پژمردگی سی چھا گئی تھی۔ وہ متعجب ہو کر چند قدم آگے بڑھی جیسے مجھے پھر سے روکنا چاہتی ہو اور پھر وہیں ٹھہر کر اس نے زمین پر گرے ریکٹ کو اٹھایا اور سراسیمہ ہو کر مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی میرا غصہ کم نہیں ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا اور اب خود پر آنے لگا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس نے چہکتے ہوئے خوشی سے سرشار کیسے ریکٹ کو میری جانب اچھالا تھا اور اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دی تھی لیکن میرے نظرانداز کرنے پر پھر اسے کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی، ایسا ہی کچھ سوچتے ہوئے میں مضطرب سا ہو کر کبھی آرام کرسی پر جا بیٹھتا تو کبھی بستر پر لیٹ

جاتا اور سوچنے لگتا کہ مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اسے ہمارے ہاں آئے ابھی دن ہی کتنے بیتے تھے اور وہ یوں میری ذات سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی تھی' میرے ماضی سے جڑی حقیقت کا اسے کچھ تو ادراک ہو ہی چکا ہوگا۔ بڑے ابا سے نہیں' ماں' ابا اور بھائی سے بھی نہیں یا گھر کے کسی ملازم سے نہ سہی وہ اب تک بھابی سے تو جان پہچان بنا چکی تھی وہ اسے میرے متعلق کچھ نہ کچھ تو بتاتی ہوں گی' یوں پھر اسے میرا احترام نہیں کرنا چاہیے تھا' مجھ سے اسے کسی قسم کی کوئی ہمدردی بھی نہیں ہونی چاہیے تھی اور میں کسی قسم کی ہمدردی کے قابل ہی کہاں تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر آبیرہ بھی تو میرے دل سے زیادہ قریب تھی۔

ہم زندگی میں جن دوستوں پر اپنی ذات سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے بنا رہ ہی نہیں سکتے' ہمارے لیے وہ اپنی جان تک دے سکتے ہیں' انہیں ہم سے اس قدر محبت ہے' وہی اپنے بن کر دغا دے جاتے ہیں۔ شاید زندگی کو اسی لیے ایک معلم کی طرح کہا گیا ہے کہ وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ یہ ہمیں کئی طرح کے درس دیتی ہے۔

یونہی وقت نے مجھے بھی ایک ایسی ہی حقیقت سے لذت آشنائی دلائی تھی یہ خیال آتے ہی میں دھیرے دھیرے اپنے ماضی میں اترنے لگا تھا۔ جب ان دنوں مجھ پر اک عجیب سیمابی کیفیت طاری رہتی تھی' مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کا بوجھ مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا اور میں بے کل سا ہو کر یہ سوچ کر گھر سے باہر چلا جاتا تاکہ باہر کی رونق میں کسی طرح سے اپنے دل کو بہلا سکوں' اپنے ضمیر کی آواز کو دبا سکوں لیکن پھر وہی باہر کی رونق میرے لیے عذاب بن جاتی اور میں مضمحل سا ہو کر وہاں سے سیدھا گھر پلٹ آتا' گھر پہنچ کر اپنے کمرے کو مقفل کر کے بستر پر پڑا رہتا اور چند لمحے ہی راحت میں کٹتے کہ پھر سے دھیرے دھیرے میرا کمرہ بازگشت بننے لگتا اور میرے ضمیر کی آہنی ضربیں مجھے بے کل سا کیے دیتیں اور جب یہ خاموشی میں گونجنے والی بازگشت میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگتی تو میں سوچنے لگتا کہ کسی سے اپنی کیفیت بیان کروں تو ہوسکتا ہے کچھ راحت نصیب ہو لیکن کہوں تو کسے' ماں اور ابا تو میرا چہرہ تک نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ بھابی اور بھائی بھی مجھ سے خفا تھے۔ اک بڑے ابا ہی تھے تو انہیں میں اپنی بپتا سنا کر مزید آزردہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یونہی ژولیدہ حال ہو کر میں ہیوی بائیک لے کر جو گھر سے نکلتا تو میرا مقصد فقط اپنے کسی دوست سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہوتا تھا۔ اسی مقصد سے پچھلے کئی روز سے میں آبیرہ کے گھر کے چکر لگا چکا تھا اور ہر بار مجھے اس کے گھر کے ملازم سے یہی سننے کو ملتا کہ بی بی صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔

آج میں نے پھر سے اس سے ملنے کی خاطر اپنی بائیک اس کے گھر سے باہر جا روکی تھی۔ سوئچ آف کر کے میں بائیک سے اترنے لگا تو جیسے اپنے پیروں پر لڑکھڑا سا گیا تھا۔ میں نشے میں کب تھا' بلکہ اب تو میں ہر قسم کا نشہ ترک کر چکا تھا۔ پھر شاید یہ ان چیزوں کی طلب تھی لیکن ایسا بھی نہ تھا' میں کئی بار چیلنج کے طور پر نشہ ترک کر چکا تھا اور مجھے ایسا کرنے میں اب مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ یقیناً پھر یہ میرے دل کا بوجھ تھا' یا میرے ضمیر کی آواز تھی' جو اب جاگ چکا تھا اور دل کا بوجھ ایک بھاری نشہ بن کر میرے اعصاب سلب کیے جا رہا تھا۔ میں کافی عرصہ تو صبر کرتا رہا خود سے ہی لڑتا رہا۔ بارہا سوچتا رہا کہ اگر میں اپنے ماضی کو بھلا نہ سکوں تو وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ لامحالہ اس کے ساتھ جینا تو سیکھ ہی لوں گا لیکن پھر ہر بیتا دن ہر بیتا لمحہ مجھے پہلے سے بھاری لگنے لگتا تھا۔ اپنے اوپر طاری اسی بوجھ کو کسی طرح سے ہلکا کرنے کی خاطر میں آبیرہ سے ملنے آیا تھا۔ وہ میری یونیورسٹی فیلو تھی۔ ہم لوگوں کی بہت سی شامیں ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ اگر ہم یونیورسٹی بھی جاتے تھے تو یہ فقط ملاقات کا ایک ذریعہ ہوتا تھا۔ ہر ہفتہ اور اتوار کی شب جو میرے فارم ہاؤس پر جشن ہوتا تھا تو وہ بھی آبیرہ کے نام ہوتا تھا۔ یکا یک مجھے آہنی دروازے کا چھوٹا پٹ کھلنے کی آواز آئی' میں بیل بجا کر اب دروازے کے پاس ہی دیوار سے پشت ٹکائے آنکھیں موندے کھڑا تھا۔

''صاحب آپ۔'' ملازم نے باہر نکلتے ہی حیرت سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

''مجھے آبیرہ سے ملنا ہے۔'' حیرت زدہ سے کھڑے ملازم کی بات سن کر میں نے جواب دیا۔

''صاحب! آبیرہ بی بی تو سوچکی ہیں۔'' ملازم نے فوراً جواب دیا جسے سن کر میں نے اپنی جیب سے فون نکالا' ابھی پونے دس ہورہے تھے۔ وہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہ تھی۔ میں نے سوچا۔

''دیکھنا اگر سوئی ہوئی ہیں تو ابھی جاگ جائیں گی تمہاری بی بی صاحبہ۔'' میں نے فون سے آبیرہ کا نمبر ملا کر اپنے سامنے کھڑے ملازم کو یوں دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑنے کی کوشش کررہا تھا۔

لیکن شاید وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ آبیرہ نے میرے دو' تین بار کال کرنے پر بھی کال وصول نہ کی تھی۔ اب میں ملازم سے کیا کہتا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے بارہا کال کرنے کے باوجود آبیرہ نے میری کال ریسیو نہ کی تھی تو اس نے پلٹ کر دروازہ بند کرلیا تھا اور میں بائیک اسٹارٹ کرنے کے بعد جیسے ابھی تک تذبذب کا شکار اوپر بالکونی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

بالاخانہ کی پہلی منزل پر بالکونی سے ملحقہ کمرہ آبیرہ کا ہی تھا جہاں برقی قمقمے بھی روشن دکھائی دے رہے تھے۔ پھر جانے مجھے کیا سوجھی میں نے جو بائیک اسٹارٹ کی تھی تو فوراً ہی بند کرتے ہوئے اسے ذرا پیچھے لے جا کر دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا پھر ایک پیر بائیک پر ٹکاتے ہوئے ذرا سا سہارا لے کر میں دیوار پر چڑھا اور اگلے ہی لمحے اندر کود گیا تھا۔

میرے لیے اس انداز میں آبیرہ کے کمرے تک پہنچنا کوئی نئی یا انوکھی بات بھی نہ تھی۔ اکثر عید کا تحفہ اسے میں اسی انداز میں آکر دیا کرتا تھا لیکن اندر کودتے ہی یکا یک جو مجھے اس کے گھر میں موجود سربین ڈاگ کا خیال آیا تو جیسے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر ہی جھٹ سے اس پائپ تک جا پہنچا جس کے سہارے مجھے بالکونی تک پہنچنا تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ آبیرہ کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ میں نے بالکونی میں کھلنے والے دروازے کو ذرا سا دبایا' وہ اندر سے بند تھا' لیکن مجھے اندر سے مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ وہ آبیرہ کی ہی آواز تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کررہی تھی۔ میں دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں مجھے اس کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی تک فون پر کسی سے باتیں کررہی تھی۔ جب میں نے اپنے کان کھڑکی سے لگا دیئے۔ ''طٰہٰ پاگل ہوچکا ہے۔ داؤد مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی ایسے پاگل شخص کو کسی نے یوں کھلا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ آج

پھر آیا تھا' میرے گھر وہ تو اچھا ہوا جو میں نے پہلے سے ہی ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ وہ موقع محل دیکھ کر اسے مناسب جواب دے دیا کرے۔ نہیں تو آج مجھے اس کی ابنارمل باتیں برداشت کرنا پڑتیں۔"

داؤد کو تو میں جانتا تھا' لیکن آبیرہ...... تم ایسی نکلوگی یہ میں نہیں جانتا تھا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھیں برس پڑیں یارب...... اور میں اگلے چند لمحوں تک گھٹنوں میں سر دیئے دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھا رہا۔

جہاں ایک جانب میں اس کی بے وفائی پر رنجیدہ آنسو بہا رہا تھا تو دوسری طرف آبیرہ اب قہقہے لگا لگا کر داؤد سے باتیں کر رہی تھی جب اس کے قہقہے میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگے تو طیش میں آ کر میرا جی چاہا میں کھڑکی یا دروازہ توڑ کر اندر جاؤں اور آبیرہ کا گلا دبوچ لوں اور اس وقت چھوڑوں جب اس بے وفا کے قفس سے روح پرواز کر جائے لیکن اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے میں نے ایسا کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب میرے اپنے مجھ سے روٹھ گئے تھے۔ دوست احباب ساتھی سبھی منہ موڑ گئے تھے اور رہی سہی کسر میرے ضمیر اور دل کی آوازوں نے پوری کر دی تھیں۔ تو ایسے میں آبیرہ نے صحیح ہی تو کہا تھا کہ مجھ جیسے پاگل شخص کو بھلا یہاں کیوں ہونا چاہیے۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے یوں دیوانوں کے سے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور بائیک واپس گھر کی جانب بڑھا دی۔

اگلے چند روز مجھے شدید بخار نے آ لیا۔ اس قدر شدید بخار نے مجھ سے جیسے میری سدھ بدھ ہی چھین لی تھی اور میں کئی روز تک ایسے ہی نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا' پھر مجھے چند روز بعد ذرا ہوش آیا تو میرے سرہانے مجھے بڑے ابا ہی دکھائی دیئے۔ وہ آنکھیں موندے اپنے سر کو دیوار سے ٹکائے ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ میری وجہ سے ان کا سکون بھی غارت ہو چکا تھا۔ کتنا برا تھا میں یارب مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔ میں نے جو لمحہ بھر کو اپنی آنکھیں کھولی تھیں تو بڑے ابا کو یوں بے آرام پا کر مضطرب ہو کر پھر سے موندھ لیں۔

یکایک مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ جب دستک مسلسل ہوتی رہی تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنے پر چند لمحوں تک مجھے یونہی محسوس ہوتا رہا جیسے میرا وجود شدید بخار سے تپ رہا ہو۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھولا تو میرے سامنے یومنہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہے۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہی میں نے اپنے سخت رویے کی وجہ سے اس کی دل آزاری کے لیے اس سے معذرت چاہی۔ میری بات سنتے ہی وہ میری سوچ کے برعکس فوراً بولی۔

"ارے طٰہٰ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنوں سے بھلا کوئی معذرت کرتا ہے۔ مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ میں اسی لیے آئی ہوں۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاید اسے میرے سخت رویے کی وجہ سے دکھ پہنچا ہوگا لیکن اس کے رویے سے مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی باتوں میں تو کس قدر اپنائیت تھی۔ مجھے خاموش پا کر وہ پھر سے بولی۔

"دراصل اس ویک اینڈ پر چند چھٹیاں آ رہی ہیں۔ جن میں مجھے گھر جانا ہے' لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ خریداری کرنا تھی۔ اگر آپ میرے ساتھ چل

سکیں تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔" وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب میرے جواب کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کی بات سن کر میں گم صم سا یہ فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں پھر لامحالا جو میں نے ہامی بھر لی تو اس کا چہرہ یوں خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ مجھے آج شام کا وقت بتا کر چلی گئی اور میں وہیں چپ چاپ سا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ میرے جیسے شخص کے ساتھ وقت بیتانے میں بھی کوئی خوشی محسوس کر سکتا ہے۔ ذرا شام سے پہلے میں ایک بار پھر سے اسی قسم کی کشمکش سے دوچار ہو رہا تھا کبھی تو میرا جی چاہتا کہ میں کوئی بہانہ بنا کر اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دوں یا کہیں باہر نکل جاؤں اور پھر جب دوبارہ اس سے ملاقات ہو تو اسے کہہ دوں کہ مجھے کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ میں یونہی منصوبے بنا رہا تھا کہ جب بابا عبدالقادر یومنہ کا پیغام لے کر میرے کمرے میں پہنچے۔ وہ مجھے کہنے آئے تھے کہ یومنہ پورچ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ یوں اب میرا کچھ بھی سوچنا بے کار تھا۔ میں بابا عبدالقادر کے تعاقب میں پورچ تک پہنچا تو یومنہ گاڑی کے پاس کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور میں نے جواب دیتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو اس کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

گھر کے خاص دروازے سے نکل کر ایک طرف کو مڑتے ہوئے میری نظر گاڑی میں نصب میوزک سسٹم پر پڑی جسے کبھی میں گاڑی میں بیٹھتے ہی آن کر لیا کرتا تھا تو خاص قسم کے ووفر سسٹم سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے قریبی گھروں کے دریچے اور شیشے لرز اٹھا کرتے تھے اور وقت بے وقت تنگ ہونے پر لوگ مجھے کوستے بھی ہوں گے لیکن آج مجھے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

گاڑی میں کافی دیر سے خاموشی تھی اور میری نظریں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں۔ جب یکا یک یومنہ نے اس خاموشی کو توڑا۔

"آپ سے ایک سوال پوچھوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ یومنہ سوال پوچھنے کے لیے آپ کو میری اجازت کی ضرورت نہیں۔" وہ کچھ پوچھنے میں خوف محسوس کر رہی تھی۔ جب میں نے اس کے خدشات دور کرنے کے لیے فوراً جواب دیا۔ میرا جواب پا کر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں حالانکہ آپ کی عمر کے لوگ تو فرائض تک کی ادائیگی سے دور بھاگتے ہیں؟" یومنہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب جواب کی منتظر تھی جب کہ میں سوچ رہا تھا کہ ایسا سوال کرنے والی وہ پہلی لڑکی تھی کبھی تو اپنے دل کی کیفیات بیان کرنے کے لیے میں کوئی رازداں ڈھونڈا کرتا تھا اور لوگ مجھ سے دور بھاگتے تھے اور آج جب میں نے چپ سادھ لی تھی تو کسی نے یوں اپنائیت سے کچھ جاننا چاہا تھا۔ جس کا جواب بھی میں پوری ایمانداری سے دینا چاہتا تھا۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں، یہی سوال ہے ناں آپ کا؟" اسے مخاطب کرتے ہوئے میری نگاہیں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں اور بے تحاشا ٹریفک کے درمیان میں مکمل چوکس ہو کر ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ جب کچھ توقف کے بعد میں نے اپنا سلسلہ کلام جوڑا۔

"اچانک سے ظاہر ہو جانے والا ایسا مرض جس

کی شناخت ہی نہ ہوسکے اور آپ کو لگنے لگے کہ اب آپ اس اذیت زدہ کیفیت سے کبھی نکل ہی نہ پائیں گے کیسی تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ تب آپ کہ پاس کرنے کو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسپتال کے کسی وارڈ کے بوسیدہ حبس زدہ سے کمرے کے کسی بستر پر پڑے آپ کیا کر سکتے ہیں' فقط اپنی موت کا انتظار۔ قطار در قطار لوگ آپ کے سرہانے بدلتے رہیں گے' روز نئے نئے چہرے آپ کو دکھائی دیں گے بعض آپ کو دلاسہ دیں گے حوصلہ وہمت رکھنے کی تلقین کریں گے اور جاتے ہوئے چند پیسے آپ کے سرہانے رکھ کر چلے جائیں گے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ کا کوئی سگا آپ کے لیے دعا کردے گا۔ ان قیمتی سانسوں کو جو رب سوہنے نے ہزار نعمت کی طرح عطا کی تھیں۔ میں نے کبھی ان کی اہمیت کو نہ جانا تھا۔ جیسے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کیا ہوگا؟ طٰہٰ عالم کے پاس اتنا سب کچھ ہے' روپیہ پیسہ ہے' اثر ورسوخ ہے' مجھے بھلا کیا ہوسکتا ہے' کوئی ہمارے خاندان کی طرف آنکھ اٹھا کر تو دیکھے' ہمیں کچھ کہہ کر تو دیکھے اسے میں وہاں پہنچا دوں گا جہاں سے پھر وہ کبھی واپس نہ آپائے گا۔

میں ساری دنیا میں گھوم پھر سکتا ہوں' بنا روک ٹوک کہیں بھی آجا سکتا ہوں کسی بھی بڑے سے بڑے ریسٹوران میں جا کر ٹھہر سکتا ہوں' میں پیسے سے دنیا جہاں کا ہر آرام وآسائش خرید سکتا ہوں' مجھے کیا ہوسکتا ہے؟

کوئی ہے جو ہماری ٹکر میں آسکے شہر بھر کے لوگ ہم سے ڈرتے ہیں۔ کبھی کسی کی ہمت نہیں ہوسکی کہ کوئی ہمارے سامنے اونچا بول سکے' کوئی ہماری برائی کرسکے۔

شہر میں گزرتے ہوئے ہمیں بڑے بڑے پروٹوکول ملتے ہیں۔ ہمارے لیے شاہراہیں بند کروادی جاتی ہیں۔ ہم بلٹ پروف گاڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مجھے ایسے میں بھلا کیسے کچھ ہوسکتا ہے' کیسا نادان تھا' میں کتنا غفلت میں ڈوبا ہوا تھا' پھر اس نے مجھے یہ احساس دلا ہی دیا۔

معالج نے جب جواب دے دیا تو اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ آپ چاہے دنیا بھر کے کسی بھی اسپتال میں چلے جائیں وہاں آپ کو یہی جواب ملے گا کہ انہیں کوئی ایسی طبی بیماری نہیں جو ہماری میڈیکل رپورٹس میں ظاہر ہورہی ہو' یہ بات جان لینے کے باوجود ملک بھر کے کونے کونے میں واقع ہر وہ جگہ جہاں اعلیٰ معالج اور لیب کی سہولیات دستیاب تھیں ۔میرے ٹیسٹ کروائے گئے لیکن کہیں کچھ ظاہر نہ ہوا۔ میں ہر گھڑی ہر ہر لمحہ موت کے منہ سے قریب تر ہوتا چلا جارہا تھا اور میڈیکل میں میری اس بیماری کی کوئی شناخت ہی نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے یہ بیماری جسمانی ہوتی تو رپورٹس میں اس کی کوئی شناخت ظاہر ہو پاتی۔

یہ تو مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کی سزا تھی جو ناسور بن کر میرے وجود میں ہی نہیں بلکہ میری روح میں اپنا گھر بنا چکی تھی اور جب روح بیمار ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی خوردبین اس بیماری کے وجود کو ظاہر نہیں کرپاتی۔

آپ نے یہی دریافت کیا تھا ناں کہ میں ہر وقت عبادت میں کیوں مشغول رہتا ہوں' آج دوبارہ ملی تندرستی مجھے اتنی پیاری ہے کہ میں اپنا ہر لمحہ ہر گھڑی خدا کے حضور عبادت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میری صبح ہو تو خدا کی حمد وثناء سے ہو۔ رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹوں تو اپنے رب سوہنے کو ہی یاد کرتے ہوئے مجھے نیند آئے اور

نیند میں لاشعوری کیفیت میں بھی میں کسی ایسے خواب میں داخل ہوجاؤں جو مجھے میرے اللہ سے اور قریب کردے۔'' آخری بات کہتے ہوئے میں نے جو سر گھما کر ایک نظر اس کی جانب دیکھا تو وہ بے حس وحرکت حیرت زدہ سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''طٰہٰ...... آپ سے وہ جرم کیسے سرزد ہوا تھا...... میں جاننا چاہتی ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد یومنہ نے یوں ٹھہر ٹھہر کر اپنے سوال کو بیان کیا کہ جس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آرہی تھی کہ اب وہ میرے گزرے کل کے بارے میں جاننے کے لیے کتنا بے تاب ہورہی تھی۔

''یومنہ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ اس وقت میرے ساتھ خریداری کرنے آئی ہیں اور میرے ماضی سے متعلق بہت کچھ تو آپ پہلے سے ہی جانتی ہیں۔'' میں نے اسے ایسا جواب اس لیے دیا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنے ماضی کے تلخ باب کو کھول کر بیٹھ جاؤں اور میری وجہ سے اس کی خریداری متاثر ہو۔

''اگر میں پہلے کچھ سن چکی ہوں طٰہٰ تو اب مجھے آپ سے جاننا ہے۔'' یومنہ بضد تھی اور درحقیقت میں بھی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی کو تو میں بیان کروں۔ اپنے وہ احساسات' کیفیات' وہ گھڑیاں جو مجھ پر قیامت بن کر بیتی تھیں۔ ''میں آپ کو وہ سب بتاؤں گا لیکن یہ ایک طویل داستان ہے۔ ابھی اسے رہنے دیں۔'' میرا جواب پاتے ہی وہ فوراً بولی۔

''مجھے ان لمحوں کا انتظار رہے گا طٰہٰ۔'' یومنہ کے جواب دینے تک میں شہر کے ایک بڑے پلازہ کے پارکنگ ایریا میں گاڑی روک چکا تھا۔ یہ شہر کا ایک بڑا اور معروف ترین شاپنگ سینٹر تھا۔ یومنہ اور میں اندر داخل ہوئے' کھلے کھلے چہرے' میٹھے میٹھے قہقہے...... سرگوشیاں اور موسیقی کی چھیڑی دھنیں ہم جگمگاتی رنگا رنگ دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جب یومنہ ایک سن گلاسز والی دکان کے سامنے پہنچ کر رکی اور مجھے لے کر اندر داخل ہوگئی۔ وہ اندر پہنچتے ہی مختلف قسم کے گلاسز دیکھنے لگی۔ مجھے لگا اسے وہ سن گلاسز اپنے لیے لینا تھے لیکن پھر ایک دم سے اس نے ایک گلاسز میری جانب بڑھا دیئے۔ ''یہ آپ کے چہرے پر بہت جچے گا۔'' میں خود بھی گلاسز کا بے حد شوقین تھا لیکن اس کی پسند واقعی لاجواب تھی۔ یہ اوکلے کے سن گلاسز تھے۔ میرے چہرے پر انہیں سجاتے ہی دکان دار لڑکے نے آئینہ میرے سامنے کردیا۔

''صاحب ایک دم دبنگ لگ رہے ہو'' اس کی بات سن کر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''طٰہٰ آپ مسکراتے ہوئے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔'' یومنہ نے مجھے پہلی بار مسکراتے دیکھا تھا اور پھر برجستہ تعریف بھی کردی تھی۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے گلاسز کے پیسے مجھے نہیں دینے دیئے تھے اور انہیں خریدنے کے بعد ہم وہاں سے آگے بڑھے۔

جب یومنہ نے اپنی خریداری مکمل کرلی تو پھر چلتے چلتے میں ایک دکان کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا تھا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ اس دکان میں داخل ہوئی تو متعجب سی ہوکر میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسا کہ دکان میں داخل ہوتے ہوئے وہ باہر کانچ کے باکس میں سجی ڈمیوں سے اندازہ لگاسکتی تھی کہ یہ حجاب' اسکارف اور اوعبایا جیسے خواتین کے اسلامی لباس کی دکان تھی۔ اندر پہنچ کر میں نے ایک عبایا خریدا' وہ ساتھ کھڑی کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ جب پیسے ادا

کر کے میں نے وہ عبایا اسے دیتے ہوئے کہا۔

"یومنہ آپ کو یہ میری طرف سے گفٹ ہے۔"

اسے میرا یہ تحفہ لیتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ وہ حیرت زدہ سی جیسے اسے لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب مسکراہٹ بھی کچھ پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھی۔ گویا اسے کچھ بہت اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ہم دکان سے نکلے اور پھر اس پلازہ کے اس خاص دروازے کی جانب بڑھے جہاں سے ہمیں باہر نکلنا تھا۔ وہ اب چپ چاپ سر جھکائے جیسے کچھ سوچتی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دروازے تک پہنچے اور پھر میں وہی ٹھہر گیا۔ اس جگہ میرے ساتھ کوئی واقعہ بیت چکا تھا۔ میری کوئی یاد اس جگہ سے جڑی تھی' پھر کوئی جھماکا سا ہوا اور میرے گردونواح کا منظر تیزی سے بدلنے لگا اور اب میں جس منظر میں اتر چکا تھا' یہ اسی سلسلے کی اگلی کڑی تھی' جب یومنہ کے دروازہ کھٹکھٹانے پر میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا تھا۔

چند روز تیز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد جو میری طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو بڑے ابا نے مجھے مائیکل کے ساتھ باہر گھوم پھر آنے کو بھیج دیا تھا اور اس روز کچھ خریدنے کی غرض سے میں اسی پلازہ میں آیا تھا۔

یہاں اسی جگہ میں نے آبیرہ کو داؤد کے ساتھ خریداری کرتے دیکھا تھا۔ انہیں ایک ساتھ دیکھ کر میرا جوان خون کھولنے لگا تو میں خود پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں دوڑا اور اس سے پہلے کہ میں ان تک پہنچتا آبیرہ نے یوں غصے سے مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا' داؤد اس سے کچھ فاصلے پر آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ داؤد کی جانب دوڑی اور اسے داؤد کی طرف بڑھتے دیکھ کر مجھے لگا میں انگریزی فلم ورلڈ وار زی کا وہ وائرس زدہ انسان ہوں جس سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی حالانکہ میں تو فقط ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آبیرہ اگر آج میں کوئی دیوانہ یا خبطی انسان ہوں تو ہمیشہ ایسا تو نہ تھا' پھر کیا ہوا جو آج تم مجھ سے یوں نگاہیں بدلنے لگی ہو۔ میری اس چاہت' پیار اور محبت کو بھلا کر آج تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔ میرے اس تک پہنچنے سے پہلے اب داؤد میرے سامنے کھڑا تھا۔ "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ داؤد۔" میں نے غصے سے چیختے ہوئے داؤد سے کہا اور اس نے اگلے ہی پل مجھ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ میں تو پہلے سے ہی غصے سے پاگل ہو رہا تھا' اس کے ہاتھ اٹھاتے ہی اپنے آپے میں نہ رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اب اس کی گردن میرے بازوؤں کی گرفت میں تھی اور وہ چھڑوانے کی لگاتار کوشش میں تھا۔ میں اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیے اس پر ایک ہاتھ سے گھونسوں کے وار کیے جا رہا تھا اور چند لمحوں میں ہی ہمارے اردگرد لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ ہم پلازہ کے بیرونی دروازے کے سامنے ہی گتھم گتھا تھے۔ جہاں چند گارڈ بھی کھڑے تھے پہلے تو چند ایک لوگوں نے آگے بڑھ کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن تب تک میں داؤد کی خوب درگت بنا چکا تھا اور خون اس کے چہرے سے رسنے لگا تھا۔ جب لوگ ہمیں الگ کرنے میں ناکام رہے تو پھر گارڈز نے مجھے داؤد سے جو الگ کیا تو میں پھر کر ان دو گارڈز سے چھوٹ کر پھر سے داؤد کو دبوچ لیتا اور وہ پھرتی سے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی بیچ آبیرہ کا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ وہ داؤد کو مجھ سے بچانے کے لیے لوگوں کو پکارتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں پھر سے

چھوٹ کر داؤد اور آبیرہ تک جا پہنچا گارڈز مجھے ان سے دور لے گئے تھے اور ساتھ ہی چند لمحوں میں پولیس کی گاڑی کے سائرن سنائی دینے لگے تھے۔ مائیکل پارکنگ میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا اور پولیس مجھے گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے جا رہی تھی۔ جب پولیس کی گاڑی میں، میں بے حس و حرکت بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے مائیکل پارکنگ میں گاڑی کے پاس کھڑا سگریٹ پیتا دکھائی دیا لیکن اسے چند لمحوں پہلے ہوئے اس حادثے سے آگاہ کرنے سے زیادہ مجھے فکر اس بات کی تھی کہ میری ایسی حرکت سے اب بڑے ابا کو کس قدر تکلیف پہنچے گی۔

''طٰہٰ...... طٰہٰ آپ ٹھیک تو ہیں۔'' مجھے دور کہیں فاصلے سے کوئی آواز آتی سنائی دی۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی یومنہ میرا بازو تھامے آوازیں دے رہی تھی۔ جنہیں سن کر پاس کھڑے چند ایک لوگ بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں جیسے منوں بھاری وجود کو گھسیٹ کر یومنہ کے ساتھ چلنے لگا۔ اس گھڑی مجھے دیکھنے والے لوگ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں کوئی سائیکالوجی کے کسی دماغی مرض کا شکار ہوں۔ یومنہ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگز پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے میرا ایک بازو تھامے مجھے پارکنگ ایریا تک لے گئی تھی۔



گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ میرے لباس تبدیل کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بابا عبدالقادر کمرے میں آئے۔ وہ مجھ سے کھانے سے متعلق دریافت کرنے آئے تھے' بھوک محسوس نہ کرنے پر میں نے انہیں کھانا لانے سے منع کر دیا تھا اور وہ مزید کسی بھی سوال و جواب کے خاموشی سے کمرے سے چلے گئے تھے۔ بڑے ابا کی طرح بابا عبدالقادر بھی مجھے خوب سمجھتے تھے۔ مجھے کچھ کچھ یاد ہے' جب میری طبیعت بگڑ جاتی تو میری ویسی حالت دیکھ کر وہ پاس کھڑے کیسے رویا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ آج جو میں اپنے پیروں پر چلنے پھرنے اور خود زندگی گزارنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بابا عبدالقادر کی وہ چھپ چھپ کر روتے ہوئے مانگی دعاؤں کا کتنا اثر شامل تھا۔

ایسے ہی سوچتے ہوئے میری نظر بابا رب نواز کی دی چادر پر پڑی' مجھے یاد آیا کہ میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی روز بڑے ابا کے ساتھ جا کر میں یہ چادر بابا جی کو لوٹا دوں لیکن بارہا چاہنے کے باوجود کوئی نہ کوئی کام آڑے آ ہی جاتا یا کبھی یہ بات میرے ذہن سے محو ہو جاتی تھی۔ ابھی رات کافی بیت چکی تھی۔ بڑے ابا اب سو چکے ہوں گے یہ سوچ کر میں نے ان کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ پھر یونہی میرے ذہن میں ایک دم سے ایک سوال اٹھا۔ آج یومنہ کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے میں نے اسے عبایا تحفتاً دیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میرے اس تحفے سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ملی تھی اور میرے ذہن میں اس وقت یہی چل رہا تھا کہ کیا وہ میرے اس تحفے کو اسی مقصد سے استعمال کرے گی جس مقصد کے تحت میں نے اسے وہ تحفتاً دیا تھا؟ یا پھر وہ اسے کہیں سنبھال کر رکھ دے گی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے استعمال کرے گی بھی یا نہیں لیکن میں اتنا ایمانداری سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے اسے جو تحفتاً عبایا لے کر دیا تھا ایسا میں نے بالکل درست کیا تھا اور شاید یہ مجھے اس لیے بھی درست لگنے لگا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک لباس ہی تحفتاً دینے پر میں نے کسی کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ ایک وہ بھی لباس ہی تھا اور ایک یہ بھی لباس ہی تھا لیکن

دونوں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا اچھائی اور برائی میں جیسے کسی سیاہ اور سفید میں......!

دسمبر کی انیس تاریخ میں کبھی نہیں بھولتا تھا اور اس سال بھی دسمبر کی انیس تاریخ میں چند روز ہی باقی تھے۔ میں آبیرہ کو ہر سال مہنگے سے مہنگا تحفہ دینے کی کوشش کرتا تھا اور اس سال بھی میں اسے کوئی خوبصورت اور مہنگا ترین تحفہ دینا چاہتا تھا۔

دسمبر کی دودھیا سفید کہر سے لپٹی سرد شام میں میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اسے اس سال میں ایسا کیا تحفہ دوں۔ وہ کیا خاص چیز ہونی چاہیے جو پچھلے چند سالوں میں میرے دیئے تحائف سے الگ ہو' میں آبیرہ سے بے حد محبت کرنے لگا تھا۔ ویسی ہی محبت جیسی میری عمر کے نوجوان اکثر اس عمر میں کرنے لگتے تھے۔ میں ارادہ کر چکا تھا کہ اس سالگرہ کے بعد میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنالوں گا' اور میرے ذہن میں یہ بھی چل رہا تھا کہ مجھے جلد سے جلد اپنے ماں اور ابا سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔ آبیرہ جیسی چندے آفتاب چندے مہتاب اور ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کے رشتے سے وہ بھلا کیونکر انکار کریں گے یہ سوچ کر میں ان کی طرف سے بھی مطمئن ہو جاتا تھا۔ دسمبر کی آخیر سیاہ راتیں ہر طرف چھائی گاڑھی دھند درختوں سے جھڑتے زرد پتے اور اس عالم اداسی میں' میں دفعتاً اچھل پڑا۔ دودھیا سفید پیرہن جسے پہن کر وہ کوئی اپسرا لگے' ایک ایسا لباس جو آبیرہ جیسی شخصیت کے شایان شان ہو' جسے وہ پہن کر جب اپنی سالگرہ کا کیک کاٹنے کے لیے سبھی کے سامنے آئے تو تقریب میں مدعو لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ وہ طٰہٰ عالم جس پر شہر بھر کی لڑکیاں فدا تھیں۔ اس کے ساتھ دو گھڑی بتانے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی تھیں۔ وہ بھی دیکھ سکیں کے خود طٰہٰ عالم کس پر فدا ہے۔

پھر جتنا میرے لیے کٹھن یہ سوچنا تھا کہ میں اسے تحفے میں کیا دوں' اس سے کئی گنا دشوار اس لباس کو کھوجنا تھا۔ اگلے دو روز میں نے وہ لباس کھوجنے میں لگا دیئے تھے۔ پھر شہر کے ایک بہترین ڈیزائنر کا ہی تیار کردہ وہ لباس تھا جو کہ ابھی تک کسی بھی ماڈل کے تن پر نہ سجا تھا اور نہ ہی کسی ماڈل نے ریمپ پر چل کر اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیزائنر نے مجھ سے اس لباس کی قیمت چار گنا کے حساب سے زیادہ وصول کی تھی۔

اسے لے کر میں گھر پہنچا اور گھر پہنچتے ہی میں نے آبیرہ کو فون لگایا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا' کہ وہ اپنی اس سالگرہ پر میرا تحفتاً دیا لباس پہنے اور اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں اسے یہ لباس ابھی پہنچا دیتا کیونکہ آج رات ہی اس کی سالگرہ تھی۔ چند ایک بیل جانے پر ہی اس نے کال ریسیو کی اور اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں اسے بتانے لگا کہ کتنی ہی جدوجہد کے بعد مجھے وہ تحفہ ملا ہے جو میں تمہیں اس برتھ ڈے پر دینے والا ہوں۔

''ایسا کیا خاص گفٹ ہے طٰہٰ؟'' آبیرہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

''خاص تو وہ تب ہوگا جب تم اسے پہنو گی۔'' جب میں نے اسے ڈیزائنر کا نام بتایا تو اب وہ اس لباس کو دیکھنے کے لیے بے تابی کا اظہار کرنے لگی اور میں نے اسے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ چند ہی گھڑیوں تک میرا ڈرائیور وہ لباس لے کر تمہارے گھر پہنچ رہا ہے' اور پھر لباس کے ملتے ہی آبیرہ کی کال آ گئی۔ وہ لباس اسے بے حد پسند آیا تھا اور یہ جان کر میں اسے کہنے لگا کہ میں اس کی خوشی کے لیے ایسے کئی لباس تحفے میں دے سکتا ہوں۔ اس کے کال بند کرنے سے پہلے میں

نے اس سے دہرا کر پوچھا کہ آج شام داؤد بھی آرہا ہے ناں اور اس کی ہاں پر میں مطمئن ہو گیا تھا۔ داؤد آبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ تھا لیکن میرے آبیرہ کی زندگی میں آجانے کے بعد وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ آبیرہ فقط مجھے چاہتی ہے اور میں بھی آبیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آبیرہ سے بات ختم ہونے کے بعد کئی ایک اور دوستوں کو بھی میں نے کال کر کے دہرایا کہ وہ آج رات آبیرہ کی سالگرہ پر آرہے ہیں ناں۔ میں چاہتا تھا کہ سبھی دیکھ لیں کہ طٰہٰ عالم جسے شادی کے لیے منتخب کر چکا ہے۔ وہ لڑکی شہر بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

اور اب مجھے بڑی بے تابی سے اس وقت کا انتظار تھا۔ جب آبیرہ میرا تحفتاً دیا لباس پہن کر تقریب میں مدعو لوگوں کے سامنے آئے اور میں آبیرہ کی بجائے ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جب وہ مسحور ہو کر آبیرہ کو دیکھ رہے ہوں۔ جب اس کی ہم عصر لڑکیاں اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں اور میرے وہ دوست جن میں آبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ داؤد بھی شامل تھا۔ آبیرہ کو دیکھ کر میری قسمت پر رشک کریں۔ اس سالگرہ پر میں اپنے ماں' ابا اور بھائی کو بھی خصوصاً اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اگر میری کوئی بہن بھی ہوتی تو اسے میں یہ ضرور کہتا کہ آج وہ اپنی ہونے والی بھابی سے ملنے جارہی ہے۔

اس روز سر شام ہی مجھے آبیرہ کی فون کالز آنا شروع ہو چکی تھیں۔ کیونکہ پچھلی ہر سالگرہ پر میں دن کے آغاز سے رات تقریب کے اختتام تک اسی کے ہمراہ رہتا تھا لیکن آج میں عین اسی وقت پہنچنا چاہتا تھا' جب وہ سجی سنوری بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ مجھے فون پر فون کرتی رہی اور میں اسے ٹالتا رہا۔ جی۔ ایم اس وقت میرے ساتھ میرے کمرے میں ہی موجود تھے۔ وہ آبیرہ کے برتھ ڈے پر میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور آبیرہ کی میرے فون پر آتی کالز کو لے کر مجھے خوب سنا رہے تھے۔ پھر ان کی تیاری کو دیکھتے ہوئے میں بھلا کیسے پیچھے رہتا۔ ''کیوں جناب میرا تو وہاں کوئی انتظار کر رہا ہے' آپ یوں پر تکلف تیاری کے ساتھ کس کے لیے جا رہے ہیں۔'' جی ایم میری بات سن کر فقط مسکراتے ہوئے آئینے کے مقابل کھڑے ٹائی کی ناٹ کو اپنی جگہ پر جماتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک Sophisticated انسان تھے۔ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر میرے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے بالوں کو چھوا جواب بے ترتیب ہو چکے تھے۔ میں جھٹ سے اٹھ کر ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بال بنانے لگا تھا۔ تبھی بابا عبدالقادر ماں اور ابا کا پیغام لے کر آئے تو ان کے کمرے سے نکلتے ہی ہم ان کے تعاقب میں پورچ تک پہنچ گئے تھے۔ جہاں ماں' اور ابا پہلے سے کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یوں ہمارے پہنچتے ہی سبھی گاڑی میں سوار ہوئے اور مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آج شہر بھر میں دھند کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ایسا دیکھ کر میرا موڈ کچھ آف ہو رہا تھا۔ مجھے دھند بے حد پسند تھی۔ دھند سے ماحول میں اک عجیب سا افسوں بھر جاتا تھا۔ جو کہ مجھے بہت بھاتا تھا۔ جاڑے میں اکثر ہر طرف چھائے گاڑھے کہر میں' میں اوور کوٹ کے کالر اوپر کانوں تک چڑھائے سگریٹ سلگائے گھر سے پیدل چلتا' کہیں دور نکل جایا کرتا تھا اور جب سے آبیرہ میری زندگی میں آئی تھی میری دسمبر کی ہر دودھیا سفید شام اسی کے سنگ گزرتی تھی اور میں

آج بھی اسے چار سو پھیلے دودھیا سفید آنچلوں کے درمیان ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

آبیرہ کے گھر پہنچتے ہی اسے میرے آنے کی خبر ہوچکی تھی اور میری نگاہیں بھی اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں جب مجھے اس کا پیغام فون پر موصول ہوا۔ وہ میرے دیر سے آنے کی وجہ سے خفا تھی' پہلے تو میں نے اسے انتظار کروایا تھا اور اب وہ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکانا چاہتی تھی یوں سبھی بیٹھے مہمانوں کے ساتھ میں بھی اس کا انتظار کرنے لگا۔ میری طرح اسے بھی دسمبر کی سردی اور دھند بہت پسند تھی یہی وجہ تھی کہ کسی پانچ ستارہ ہوٹل بک کروانے کی بجائے اسی کی خواہش پر گھر کے لان میں ہی سارے انتظامات کیے گئے تھے' ہر میز کے قریب ہی چند فٹ اونچے گیس ہیٹر نصب کردیئے گئے تھے جن سے نکلنے والی سنہری کرنیں نہ صرف ماحول کو حسین بنارہی تھیں بلکہ ان سے نکلنے والی حرارت ماحول کو گرما بھی رہی تھیں۔

انہی دنوں ماں اور ابا جی ایم کے لیے رشتہ بھی تلاش کررہے تھے اور ایسی تقریبات ہمارے اونچے گھرانوں کے لیے ایک نادر موقع ہوا کرتی تھیں۔ ماں اور ابا تقریب میں مدعو لوگوں سے بھائی کا تعارف کروا رہے تھے اور بھائی بھی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یکایک ہی ہلکے قہقہے اور سرگوشیاں بھی تھم گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جانتا تھا کہ تم ہی ہو' میں اپنی نشست سے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور آبیرہ کو دیکھتے ہی مسکاتے ہوئے میرے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوگئے جنہیں میرے سوا کسی نے نہ سنا ہوگا۔

دودھیا سفید پیرہن پہنے وہ کوئی سفید گلاب ہی لگ رہی تھی۔ ڈیزائنر نے تو فقط اس لباس کو

تراشا تھا۔ آبیرہ کے جسم پر آتے ہی جیسے اس میں روح پڑ گئی تھی۔ شاید ہی آبیرہ کو آج سے پہلے کسی نے یوں اس روپ میں دیکھا ہو۔ اب سبھی اپنی اپنی نشست پر بیٹھ چکے تھے۔ میں اسے وش کرنے کے لیے آگے بڑھا اور پھر کسی کو دیکھ کر میں وہیں رک گیا۔ داؤد ابھی تک کھڑا تھا اور میں بھی کیسا غیور تھا۔ آبیرہ کو لوگوں کے سامنے ننگا کھڑا کر کے اب خود کو داد دے رہا تھا۔ طٰہٰ عالم دیکھ ادھر کیسی آگ بھڑک رہی ہے' میں نے قریب پہنچ کر داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اسی جگہ سے کھڑے ایک بار آبیرہ کی جانب دیکھا وہ اس وقت میرے ماں' ابا اور بھائی سے ہی مل رہی تھی۔ ماں کے اردگرد نگاہیں دوڑا کر مجھے تلاش کرنے سے یونہی لگ رہا تھا کہ وہ ان سے میرے متعلق ہی دریافت کر رہی تھی۔ ادھر میں نے داؤد کے کاندھے پر جو ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر مڑا' اس کے مڑ کر مجھے دیکھنے پر میں نے طنزاً دو ایک بار اس کے کاندھے کو تھپتھپایا لیکن ایسا کرنے سے شاید انجانے میں' میں اس کے جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ اس کے سینے میں لگی آگ کو بڑھا رہا تھا۔ وہ جواب تک کھڑا آبیرہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا' میں اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ میری ہے۔

میرا آبیرہ کو ایک ایسا لباس تحفتاً دینا جو اس کے بدن کے برہنہ ہونے کا سبب بن رہا تھا اور پھر ڈھٹائی بے حیائی کے ساتھ یہ سوچنا کہ یوں لوگ میری قسمت پر رشک کر رہے ہوں گے' کس قدر رذیل پن تھا۔ میرے ایسے فیل کرنے کی ایسی ہی سزا ہونی چاہیے تھی۔ آبیرہ...... آبیرہ ...... میں آگے بڑھا' نہ جانے کہاں سے اس قدر شدید دھند چار سو پھیلنے لگی تھی۔ ابھی تو نا تھی' میں نے سر گھما کر دائیں بائیں دیکھا' ابھی میرے قریب ہی داؤد کھڑا تھا'

تقریب میں مدعو لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ روشنی اور حرارت کے لیے لگے لیمپس' کرسیاں' میز مجھے وہاں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شدید سرد دھند میں جیسے میرا وجود منجمد ہونے لگا تھا۔

میں یہ دیکھ کر بے تاب ہو کر چلانے لگا۔ آبیرہ ......آبیرہ...... کہاں ہو تم' دیکھو میں یہاں ہوں۔ میں تمہارے گھر کے صحن میں ہی تو کھڑا ہوں پھر تم کہاں چلی گئیں' باقی سب کہاں چلے گئے' میں طٰہٰ عالم ہوں جس سے تم محبت کرتی ہو۔ میں تمہارا طٰہٰ عالم ہوں' اللہ اکبر' اللہ اکبر' کہیں دور موذن نے صدا بلند کی' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ'' میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ میں کب طٰہٰ عالم ہوں؟ میں کب اس نام کے قابل ہوں؟ میں کب طالب ہدایت ہوں۔ میں تو انسان کہلوانے کا بھی حق دار نہیں ہوں۔ کیا انسان ایسے ہوتے ہیں؟ کیا انسان اپنی عزت کو یوں سر بازار نیلام کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ جسے محبت کرتے ہیں' اسے لوگوں کے سامنے یوں نمائش کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا' اور اب زار و قطار رو رہا تھا۔

موذن فجر کی اذان دے کر خاموش ہو چکا تھا۔ دور کہیں سے کچھ دیر سے شروع ہونے والی اذان کی مدھم آوازیں بھی اب آنا بند ہو چکی تھیں اور میں بھی رو دھو کر اب یوں شانت ہو چکا تھا جیسے تالاب میں پھینکے پتھر سے پیدا ہونے والی لہریں دھیرے دھیرے کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی مٹ جاتی ہیں۔ فجر کی جماعت میں اب کم ہی وقت رہ گیا تھا۔ میں نے جھٹ سے اٹھ کر وضو کیا اور پھر یا رب نواز

کی دی چادر کو جو کھول کر کاندھوں کے گرد اوڑھا تو وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو نے میرے ذہن سے سبھی کچھ بھلا دیا تھا۔ چند ثانیے میں اسی خوشبو کے سحر میں جکڑا وہیں کھڑا رہا اور پھر مسجد کی جانب چل پڑا۔

مسجد پہنچ کر فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد میں وہیں مسجد میں بیٹھ گیا تھا اور پھر اشراق کی نماز ادا کرنے کے بعد میں جو گھر لوٹا تو اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔

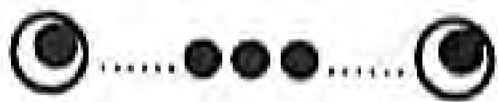
''رک جاؤ طہٰ بیٹا'' میں وہی رک گیا لیکن پلٹا نہیں۔

''کیا ابھی تک ہم سے خفا ہو بیٹا؟'' ماں نے میرے قریب آ کر پیار سے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا اور میں سوچنے لگا' آپ سے نہیں ماں' میں تو اپنے آپ سے ہی خفا ہوں۔ مجھے بالکل چپ چاپ کھڑا پا کر وہ خود ہی دوبارہ بولیں۔

''چلو میرے ساتھ میرے کمرے میں آؤ' مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' اور پھر ماں میرا بازو تھامے یوں آگے بڑھی اور میں ان کے ہمراہ یوں چلنے لگا جیسے کوئی ننھا بچہ ماں کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔

اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے ماں مجھ سے کئی باتیں کرتی رہی اور میں ان کی باتوں کا فقط ہاں ناں میں ہی جواب دیتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت کمرے میں ابا بھی ہوں گے اور ماں مجھے ابا سے ہی ملوانے لے جا رہی تھیں۔ اول تو ابا کے پاس کبھی میرے لیے کوئی وقت ہی نہ ہوتا تھا' اور کبھی جو وہ میرے پاس بھولے سے آ بھی جاتے تو چند سوال پوچھتے جن کے میری طرف سے مناسب جواب نہ ملنے پر الٹے پیروں لوٹ جاتے تھے۔

یکایک دروازے سے باہر پہنچ کر میں رک گیا۔ ''چلو بیٹا رک کیوں گئے؟'' ماں نے میرے رک جانے پر حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ماں کو یونہی ششدر کھڑا چھوڑ کر میں پلٹا مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ماں مجھے روکنے کے لیے چند قدم پیچھے آئی اور پھر مضمحل سی وہی کھڑی مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔



اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں یہی چل رہا تھا کہ اگر میں ماں کے ساتھ اندر کمرے میں چلا جاتا تو ابا مجھ سے کیسے پیش آتے۔ ضرور وہ مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ جاتے۔ آخر کو ان کا جواں سالہ بیٹا یوں دنیا جہان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ جوان کی سیاست میں ان کا ایک بازو بنا ساتھ کھڑا رہتا تھا۔ اب خود کو ہی سنبھالنے کے قابل نہ رہا تھا۔

وہ مجھ سے کئی طرح کے سوال کرتے اگر میں انہیں ان سوالوں کے تسلی بخش جواب دیتا چلا جاتا تو پھر وہ مجھے کہتے برخوردار کل فلاں جگہ جلسہ ہے' پرسوں فلاں شہر جانا ہے' اور ترسوں فلاں مجمعے کے سامنے تقریر کرنی ہے۔ یہ سب سنتے ہی مجھے نعروں کا بلند ہوتا شور سنائی دیتا۔ اسپیکروں سے نکلتی میری ہی آواز مجھے بازگشت کی طرح سنائی دینے لگتی۔ میرے اطراف میں دیجور آندھی چلنے لگتی۔ اخبارات کے صفحات ہوا میں گرد کی طرح اڑنے لگتے۔ میرا حلق خشک ہونے لگتا اور کبھی میں اپنا سر تھام لیتا۔

دفعتاً میں چلتے چلتے رک گیا تھا۔ یہ بڑے ابا کے کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ دھیرے سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ بڑے ابا اس وقت ذرا استراحت کو لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے کی

جانب مسکراتے ہوئے دیکھ کر میں ان کے پیروں میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے ان کے پیر دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ فوراً ہی جاگ گئے۔

''طٰہٰ میاں آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟'' انہوں نے آنکھیں بند ہی رکھی اور مجھے پیر دابنے سے منع کیے بغیر سوال کیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے منع کرنے کے باوجود پیر دابنے سے رکنے والا نہ تھا۔ میں ان کا سوال سن کر بھی چند لمحے خاموش رہا اور وہ بھی آنکھیں بند کیے میرے جواب کے انتظار میں خاموش رہے۔ درحقیقت میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔

''بابا رب نواز تو یاد ہوں گے بڑے ابا آپ کو۔'' میں فقط اتنا کہہ کر پھر سے خاموش ہو چکا تھا اور بڑے ابا میری یہ بات سنتے ہی فوراً اٹھ بیٹھے۔ وہ چادر کو اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھتے ہوئے بولے۔

''ایسی برگزیدہ ہستی کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔ دنیا ہر در سے مایوس ہو کر جب ان کے در پر پہنچتی ہے وہی تو پھر امید کی کرن دکھاتے ہیں۔ ایک نظر کا کرشمہ ہم نے وہیں پہنچ کر دیکھا تھا۔ ایسے اللہ کے نیک برگزیدہ بندے بھی اللہ ہی کے کرم سے ملتے ہیں۔ شاید میاں تمہارا اپنا ہی کوئی نیک عمل تھا جو ہمیں اللہ نے بابا رب نواز سے ملوا دیا۔ تمہیں چارپائی پر ڈال کر ہر طرف سے مایوس ہو کر ان تک جو لے گئے تو نہیں جانتے تھے کہ یہ کرشمہ بھی ہو جائے گا اور آج دیکھو تو وہی پہلے سے طٰہٰ عالم میاں ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے۔ بڑے ابا بابا رب نواز کی عقیدت میں سرشار جیسے بھیگ رہے تھے اور میری حالت' ان کی یہ بات سن کر کہ پہلے سے طٰہٰ عالم میاں ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے بے قرار ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ پہلے سے طٰہٰ عالم میاں نہیں بڑے ابا بلکہ بابا رب نواز کی دعا سے ملنے والے طٰہٰ عالم میاں۔'' طٰہٰ میاں آج عرصے بعد اچانک سے بابا جی کیسے یاد آ گئے؟'' مجھے چپ پا کر بڑے ابا نے سوال پوچھا تو میں جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''آپ کو یاد ہوگا بڑے ابا کہ بابا جی نے بڑی محبت سے اپنی ایک نشانی مجھے سونپی تھی اور پھر کہا تھا کہ جب اچھے ہو جاؤ تو اسے لوٹانے کے بہانے ہی اپنی شکل دکھا جانا۔''

''اور مجھے یاد ہے میاں کہ تم کوئی نشانی لئے بغیر وہاں سے پلٹنے والے کب تھے۔ وہیں ان کے پیروں میں پڑے رہتے اگر بابا رب نواز تمہیں اپنی چادر نشانی کے طور پر رکھنے کو نہ دیتے۔'' بڑے ابا نے میری بات ختم ہوتے ہی جو بات کا آغاز کیا تو گویا میری ہی بات کو جیسے فصاحت سے بیان کر دیا تھا' پھر اس سے پہلے کہ میں انہیں چلنے کے لیے اصرار کرتا انہوں نے خود ہی اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔

''میاں میرا بھی بڑا دل چاہ رہا تھا ان سے ملاقات کو۔'' ان کے منہ سے اتنا سننے کی دیر تھی کہ میں بھی جھٹ سے بولا۔

''پھر بڑے ابا انتظار کس بات کا ہے۔'' میری یہ بات سنتے ہی بڑے ابا سرعت سے بولے۔

''میاں اٹھو ابھی جاؤ مائیکل کو گاڑی تیار کرنے کو بولو' ہم ناشتہ بھی راستے میں ہی کریں گے۔''

''یہ ہوئی ناں بات بڑے ابا۔'' میں نے ان کی بات سن کر خوشی سے کہا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے میری پیشانی پر پیار کیا اور میرے کاندھے کو تھپکایا۔ پھر بڑے ابا چلنے کی تیاری میں لگ گئے اور میں نے کمرے سے نکل کر خوشی خوشی مائیکل کو بابا رب نواز کی طرف چلنے کی خبر دی تو وہ بھی خوشی سے جیسے کھل اٹھا اور کاندھے پر رکھے رومال سے جھٹ سے گاڑی

صاف کرنے لگا۔

مائیکل کو گاڑی صاف کرتے دیکھ کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا' مجھے بھی لباس تبدیل کرنا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں کمرے سے نکلنے لگا تو مجھے یاد آیا میں کچھ بھول رہا تھا۔ میں پلٹا مجھے یاد آ گیا کہ میں نے بابا جی کے لیے کافی سارے عطر خرید رکھے تھے' جو مجھے انہیں تحفتاً دینا تھے۔ الماری میں رکھے ایک بقچہ میں سارے عطر اچھے سے رکھ کر میں بقچہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ باہر پہنچ کر میں نے دیکھا بڑے ابا اور مائیکل میرے ہی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم سبھی کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ یہ اللہ والوں سے ملنے کی خوشی تھی۔ ان سے ملنے کی خواہش ہی ہمیں یوں خوشی سے سرشار کیے جا رہی تھی۔

میں اور بڑے ابا گاڑی میں سوار ہوئے تو مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بڑے ابا نے ہاتھ میں تسبیح لیے اللہ کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور میں ابھی سے جیسے مسجد سے ملحقہ اس صحن میں جا پہنچا تھا جہاں بابا رب نواز اپنے ننھے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ہی میرے کانوں سے وہ آوازیں ٹکرانے لگی تھیں۔

''ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا''

''دو ڈیوڑھا..... تین''

تین ڈیوڑھا..... چار ڈیوڑھا''

''چار ڈیوڑھا......؟''

میں اس گھڑی بابا رب نواز کے قریب فرش پر ہی بیٹھا تھا۔ جب وہ سامنے قطار میں بیٹھے اپنے کسی ایک شاگرد کو کھڑے ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کو کہہ رہے تھے۔

''ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا''

دو ڈیوڑھا..... تین''

''تین ڈیوڑھا......؟''

جونہی وہ شاگرد رک کر سوچنے لگا' بابا جی نے اسے جا کر بیٹھنے کو کہا اور بابا جی کا اشارہ پاتے ہی اب ایک اور شاگرد بچوں کے سامنے کھڑے ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا سنانے لگا۔

ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا

دو ڈیوڑھا..... تین

تین ڈیوڑھا..... چار ڈیوڑھا

چار ڈیوڑھا..... چھ

پانچ ڈیوڑھا..... سات ڈیوڑھا

سات ڈیوڑھا......؟

وہ شاگرد بھی جب سات ڈیوڑھا پر رک کر حساب لگانے لگا تو اس کے عقب میں بیٹھے چند شریر قسم کے بچوں کی ہنسی چھوٹ گئی اور میں سوچنے لگا یا رب یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا' دو ڈیوڑھا..... تین' میں حیرت زدہ سا بیٹھا پھر سے متوجہ ہو کر بابا جی اور ان کے شاگردوں کے درمیان چل رہا تعلیم کا یہ دلچسپ سلسلہ دیکھنے لگا' لیکن اب کی بار بابا جی نے کسی بھی شاگرد کو کھڑا ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کا اشارہ نہ کیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوئے۔

''میرے بچوں! ڈیوڑھا کا پہاڑا تو تم لوگ سیکھ ہی جاؤ گے پھر اسے رٹا لگا کر یوں فرفر سے پڑھنے بھی لگو گے۔ آپ کے چند ساتھی ایسے بھی ہیں جنہیں اگر میں کہوں تو وہ ابھی سارا پہاڑا سنا دیں لیکن جو اصل بھید تھا اس پہاڑے کے پیچھے وہ کچھ اور تھا۔

آپ اس پہاڑے کو پڑھنے میں ذہن سے کتنا سوچتے ہیں۔ اس قدر محو ہو کر آپ ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرتے ہوئے آگے بڑھتے

ہیں اور اسی پل وقت کے کسی لمحہ میں آپ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔ آپ کو یہ دھیان ہی کب رہتا ہے کہ آپ کے عقب میں آپ کے اپنے ہی ساتھی آپ پر ہنس رہے ہیں۔ اسی پل میں اس برگد کے پھیلے بڑے سے پیڑ پر دیکھوتو کتنے ہی پرندے چہچہا رہے تھے لیکن آپ فقط ڈیوڑھا کے پہاڑے میں مگن ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرنے میں لگے تھے۔ پھر ہماری نمازوں سے تو یہ ڈیوڑھا کا پہاڑا اچھا۔ ہم نماز میں کھڑے اپنے رب سوہنے کی حمد وثناء بیان کررہے ہوتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے ذہن میں دنیا جہان کا حساب کتاب چل رہا ہوتا ہے' کوئی خیال یہاں سے آرہا ہے' کوئی خیال وہاں سے آرہا ہے' اور نماز فقط اٹھک بیٹھک کی مشق بن کر رہ جاتی ہے۔ نماز میں حضوری نہ ہو تو وہ نماز نہیں رہتی اور حضوری پیدا ہوتی ہے توجہ سے' خشوع وخضوع سے۔ ایک ایک آیت کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے سے' جیسے آپ بچوں میں سے چند بچوں نے ابھی ڈیوڑھا کے پہاڑے کی مشق کی۔ اب نماز ادا کرنے جائیں تو اس بات کو ذہن میں رکھیے گا۔'' سبھی بچے تو انہماک سے باباجی کی نادر باتیں سن ہی رہے تھے مجھے میرے سوال کا جواب بنا پوچھے ہی مل چکا تھا۔ باباجی نے مسکرا کر میری جانب دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں میاں پھر کب سنا رہے ہو بنار کے ڈیوڑھا کا پہاڑا۔

مجھے چپ چاپ خیالوں میں گم پاکر پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''ط' میاں' ہم لوگوں نے اپنے لیے کئی مرکز منتخب کررکھے ہیں اور ہم انہی کے گرد گھومتے چلے جارہے ہیں۔ جیسے مال' اولاد' حسن' شباب' عزت' شہرت' دفعتاً میں اپنی نشست سے یوں اچھلا اور بوکھلا کر میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تب مجھے ہوش آیا کہ میں کہیں بہت دور نکل چکا تھا۔ مائیکل کو بے دھیانی میں کہیں روڈ بریکر دکھائی نہ پڑا تھا' اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا میں تیرنے لگی تھی' مائیکل نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بعد ایک بار پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھا دی تھی۔ ہمارا اب تقریباً نصف سے زیادہ کا سفر طے ہوچکا تھا۔ جب ایک بارونق بازار میں سے گزرتے ہوئے بڑے ابا کہنے لگے کہ ہمیں یہیں رک کر ناشتہ کرلینا چاہیے۔ تب مائیکل نے بڑے ابا کی بات سنتے ہی ایک ریستوران کے پاس گاڑی روک دی تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد تازہ دم ہوکر ہم لوگ پھر سے اپنے سفر پر روانہ ہوچکے تھے۔ بڑے ابا پھر سے ہاتھ میں تسبیح تھامے سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے ذکر میں مصروف ہوچکے تھے اور میں ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ سمندر کی بیقرار موجوں کی طرح انسان دکھائی پڑرہے تھے۔

''ہم لوگوں نے اپنے لیے کئی مرکز منتخب کررکھے ہیں' اصل مرکز کو چھوڑ کر ہم فقط انہی کے گرد گھومتے چلے جارہے ہیں۔'' مجھے بابا رب نواز کے کہے یہ الفاظ یاد آرہے تھے۔ سچ ہی تو کہا تھا بابا رب نواز نے ہم اصل کو چھوڑ کر لاحاصل کے پیچھے بھاگیں گے تو حاصل فقط پچھتاوا ہی رہ جائے گا۔ جیسے آج پچھتاوا میرا مقدر بن چکا تھا لیکن کسی فورس آف اٹریکشن نے مجھے اپنے مدار سے بالکل خارج نہیں ہونے دیا تھا۔ وقتی طور پر میری رفتار سست کردی تھی۔ میرے ضمیر کو مردہ ہونے سے پہلے ہی جگا دیا تھا اور یہ سیلف ایکسپائیٹڈ کا کام میرے احساس ندامت نے کیا تھا۔

ایسا ہی سوچتے ہوئے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ اب ہم اپنی منزل

مقصود تک پہنچنے ہی والے تھے۔ مائیکل نے مسجد کے قریب پہنچ کر گاڑی روک دی اور ساتھ ہی گاڑی کا انجن بھی بند کردیا تھا۔ میں اور بڑے ابا گاڑی سے اترے آج دھوپ خاصی چمکیلی اور تیز تھی لیکن جنوری کی سرد ہوا میں دھوپ کی کیا چلتی۔ میں اور بڑے ابا آگے بڑھے مائیکل بھی ہمارے ساتھ پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ اصل چیز تو ہم گاڑی میں ہی بھول آئے تھے۔ وہ بقچہ جس میں عطر رکھے تھے اور ایک چادر یہ دونوں چیزیں میں نے مائیکل کو گاڑی سے لانے کے لیے واپس بھیج دیا تھا اور خود بڑے ابا کے ہمراہ میں اس اونچی مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے لگا جو اس شہر کی خاصی پرانی جامع مسجد تھی ۔شہر کے بیچ و بیچ ہونے کے باوجود مسجد کے اطراف میں کچھ اس قدر پیڑ پودے موجود تھے کہ یہ جگہ کچھ الگ تھلگ سی ہی دکھائی پڑتی تھی۔

مسجد کے وسیع صحن میں اترتے ہی میری ناک کے نتھنوں سے وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو ٹکرائی اور میرا ذہن جیسے اس جہاں کی ہر چیز سے بے نیاز کسی اور جہاں کی سیر کو نکل گیا تھا۔ جب مجھے بڑے ابا نے ٹوکا' میاں وہاں کہاں جارہے ہو' راستہ اس طرف ہے۔ مسجد کی عمارت کے بائیں طرف ہی وہ راستہ تھا جو مسجد کے عقب میں جانکلتا تھا' ہم اس راستے سے ہوتے ہوئے اس دوسرے صحن میں جااترے جو پہلے صحن سے ذرا چھوٹا تھا' لیکن ایک اور فرق بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ ابتدائی حصے میں فقط نماز کے اوقات میں ہی رونق دکھائی پڑتی تھی لیکن عقبی جانب مسجد کے اس حصے میں جہاں بابا رب نواز رونق افروز تھے دن' رات لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس صحن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا' ایک جانب بچے تعلیم کے لیے بیٹھتے تھے جبکہ دوسرے حصے میں وہ مصیبت زدہ لوگ بیٹھا کرتے تھے جو نہ جانے کتنے ہی میلوں کا سفر طے کرکے بابا جی سے ملاقات کو آتے تھے اور پھر اپنی باری آنے کے انتظار میں وہ یہیں اس حصے میں ڈیرہ جمالیتے تھے۔ بڑے ابا کو میں نے ذرا دیر کو اسی جگہ رکنے کو کہا میں چاہتا تھا کہ مائیکل گاڑی میں سے سامان لےکر آجائے تو ہم اندر چلیں لیکن پھر نہ جانے کس سمت سے ایک ننھے سے بچے نے آکر میرے ہاتھ کو جھنجوڑا' میں نے جو سر کو گھما کر اس کی جانب دیکھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

''بابا جی آپ کو اس طرف یاد فرمارہے ہیں۔'' یہ سن کر میں نے مسکا کر اس بچے کے گال کو تھپکایا تو وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے کسی سمت کو غائب ہوگیا تھا۔

''لو میاں بابا جی کو ہمارے آنے کی خبر ہوگئی۔''

بڑے ابا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ہم جو پہلے سے ہی شوق دیدار کو بے قرار تھے' اب ہماری بے تابی اور بڑھ گئی تھی۔ ہم بھی کچھ بھلا کر آگے بڑھے اور اس نشیبی کمرے کی سیڑھیاں اترنے لگے جو پہلے صحن سے ذرا گہرائی میں تھا۔ آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھنے سے پہلے ہی میری نظر مجمعے میں بیٹھے بابا رب نواز پر پڑی۔ ایک سیکنڈ کے کسی ہزارویں حصے میں مجھے لگا سینکڑوں طرح کی روشنیاں میری قوت بصارت سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے میں ہوش وحواس سے بیگانہ فرش پر جاگرا۔

بابا جی کی سحر بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوشی میں رہا تھا۔ بابا جی کی آواز سن کر میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ ''ایک تو بھلے آئے ہو میاں اور دوسرا تم اس عمر میں اپنے بڑے ابا کو بڑا پریشان کئے ہوئے ہو۔''

بابا رب نواز کی یہ بات سن کر میں نے سر کو جو گھما کر دیکھا تو بڑے ابا مجھے واقعی مضطرب دکھائی پڑے۔ یہ دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا اور بابا رب نواز کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ اس وقت چند اور بھی عقیدت مند بابا جی کے گرد موجود تھے۔ جب چند لمحوں کی خاموشی پاتے ہی میں نے اپنے دل میں اٹھتے سوال کو بابا جی کے سامنے کہہ ہی ڈالا۔

''آخر کو ایسا کیا ہوا جو میں یوں اپنے ہوش وحواس سے ہی بیگانہ ہو گیا تھا؟'' میرا سوال سن کر بابا جی مسکرائے اور بولے۔ ''کچھ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جن کہ نامہ اعمال میں کوئی طویل ریاضتیں شامل نہیں ہوتیں چاروں طرف سے دنیاداری کے گورکھ دھندوں اور شیطانی پانسوں میں پھنسے کسی روز جو رب تعالیٰ کی طرف سے آئی کسی آزمائش پر پورے اترتے چلے جاتے ہیں صبر، ہمت، حوصلہ اور سب سے بڑی بات جو تقویٰ رکھتے ہیں پھر وہ بارگاہ خداوندی میں ان اللہ والوں سا مقام پالیتے ہیں جنہوں نے ساری زندگی عبادتوں ریاضتوں میں بیتائی ہوتی ہے۔'' بابا جی پھر فقط اتنا ہی بول کر خاموش ہوگئے تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ میرے سوال کا جواب تو نہ تھا، شاید میں اپنی ناقص عقل وفہم سے بابا جی کی یہ پیچیدہ باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ یونہی بابا جی کے پاس بیٹھے ہوئے ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ مائیکل ابھی تک گاڑی میں رکھی چیزیں لے کر نہیں پہنچا تھا حالانکہ ہمیں بابا جی کے پاس بیٹھے کافی وقت بیت چکا تھا۔ پھر میری بے چینی کو جیسے بابا جی نے بھانپ لیا تھا۔ میں ان سے اجازت لے کر اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے مائیکل اس کمرے سے باہر ہی موجود ہو اور کمرے میں داخل ہونے سے ہچکچا رہا ہو لیکن باہر صحن میں پہنچنے پر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا، یونہی دائیں بائیں دیکھتے ہوئے میں مسجد کے بیرونی دروازے تک جا پہنچا اور بیرونی دروازے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے جو میری نظر مائیکل پر پڑی تو وہ وہیں مسجد سے باہر سیڑھیوں کے پاس سامان لئے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے میری جانب بڑھا۔

''مائیکل تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو، میں اور بڑے ابا کب سے تمہارا انتظار کررہے تھے۔'' میری بات سن کر مائیکل معذرت خواہ انداز میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''صاحب میں مسجد...... میں............ میں نے سوچا آپ کہیں......'' وہ جھجکتے ہوئے کھل کر بات نہیں کرپارہا تھا لیکن میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔

''مائیکل یہ اللہ میاں کا گھر ہے جس کے دروازے تو ہر کسی کے لیے کھلے ہیں تمہیں اندر آجانا چاہیے تھا۔ چلو اب آؤ میرے ساتھ۔'' وہ ابھی بھی ہچکچا رہا تھا اور مجھے سامان وہیں سے پکڑا دینا چاہتا تھا لیکن اب میں اسے خود اندر لے جانا چاہتا تھا اور اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ مائیکل تو مسیحی تھا۔ ہمارے ہاں تو فرقے واریت کی کچھ ایسی فضا قائم ہوچکی ہے کہ کسی ایک فرقے کے مسلمان کسی دوسرے فرقے کی مسجد میں جاکر نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ مجھے افسوس ہورہا تھا کہ آج ہم کس قدر بٹ چکے ہیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے صحن میں پہنچے تو ایک جانب لوگوں کو وضو کرتا دیکھ کر مائیکل رک گیا۔

''صاحب اللہ میاں کے گھر آہی گیا ہوں تو منہ

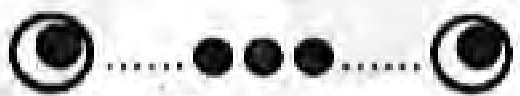
ہاتھ دھولوں۔'' مائیکل کی بات سن کر میں مسکرایا اللہ میاں کے گھر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کے ذہن میں طہارت کا خیال ہی پیدا ہوا تھا پھر مائیکل وضو خانہ کی جانب بڑھ گیا تھا اور میں ایک بغچہ جس میں وہ عطر تھے جو میں بابا جی کو تحفتاً دینے کے لیے لایا تھا اور ایک چادر جو ان کی امانت تھی اور خصوصاً جو میں انہیں شکریہ کے ساتھ لوٹانے آیا تھا۔ یہ سامان لے کر میں مسجد کے عقبی حصے کی جانب بڑھا پھر عقبی حصے کی سیڑھیاں اتر کر میں بابا جی اور بڑے ابا کے پاس پہنچا اور پھر سے سلام کرنے کے بعد بابا جی کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔

بابا جی بڑے ابا سے گفتگو میں محو تھے۔ جب ان کا سلسلہ کلام ختم ہوا تو میں نے نہایت محبت سے انہیں عطر سے بھرا بغچہ تحفتاً پیش کیا جسے انہوں نے خوش دلی سے قبول فرمالیا۔ میں نے پھر ان کی دی چادر ان کی جانب بڑھائی جسے دیکھ کر وہ مسکرادیئے کچھ دیر ایسے ہی چادر کو دیکھتے رہے اور پھر بولے۔

''طٰہٰ میاں چادر تو ہمیں لوٹانے آ ہی گئے' اب کی بار ہمارے پاس ہی ٹھہر جاؤ۔'' بابا جی کی بات سنتے ہی جیسے میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یارب میں اس قابل کہاں' مجھے جیسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بابا جی مجھے اپنے ساتھ اللہ کی راہ میں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ میرا بخت چمکانا چاہتے تھے اور میں اپنے ہی آپ میں پہیلی بنا تغافل میں پڑا رہا' وہ مجھے کہتے رہے اور میں فقط سنتا رہا۔

''کہاں تک بھاگو گے میاں کسی نہ کسی روز تو ہمارے ساتھ چلنا ہی ہے تمہیں۔'' ان کی یہ بات سن کر میں نے بڑے ابا کی جانب دیکھا۔ مجھے لگا جیسے وہ بھی تیار بیٹھے تھے اٹھنے کے لیے' میں نے سر گھما کر بابا جی کی جانب دیکھا اب کی بار وہ مسکرادیئے' انہوں نے اپنا ایک ہاتھ میرے دائیں کاندھے پر رکھا اور نہایت شفقت سے بولے۔

''جیسی تمہاری مرضی میاں یہاں زور زبردستی نہیں چلتی۔'' وہ میری حالت کو بھانپ گئے تھے۔ بڑے ابا نے بابا جی سے اجازت طلب کی اور میں جیسے بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ ان کے ہمراہ چل دیا۔ جیسے میرے وجود میں کوئی گھمسان کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ دونوں طرف کی فوجیں توپیں گاڑھے ایک دوسرے پر گولے برسا رہی تھیں اور دونوں ہی قوتیں ہم پلہ تھیں فقط کمزور تھا تو میرا وجود جسے میں گھسیٹتا ہوا بڑے ابا کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا' شاید ابھی آزمائش طویل تھی یا میں خود ہی اپنے آپ کو آزمائشوں میں ڈالنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔



بابا رب نواز کی طرف سے ہو کر آنے کے کئی دن بعد تک بھی میں مضطرب سا جیسے کسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ہر گھڑی یہی سوچتا رہا کہ آخر کو ایسا کیا بچا تھا اب میری زندگی میں جس کی خاطر میں نے بابا جی کی بات سنی ان سنی کردی۔ اور بڑے ابا کے ساتھ پھر سے گھر چلا آیا۔ بہت سوچتا رہا لیکن مجھے اس سوال کا جواب نہ ملا۔ اب میرے پاس بابا جی کی نشانی وہ کالی چادر بھی نہ تھی جس سے اٹھنے والی سحر زدہ سی خوشبو مجھے غموں سے وقتی نجات دلا کر راحت اور سکون کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتی تھی جہاں میں غوطہ زن نہ جانے کس جہاں جا نکلتا تھا۔

اگلے پل ہی میں نے ارادہ کرلیا کہ میں پہلی فرصت میں ہی بازار جا کر ویسی ہی کالی چادر خرید لاؤں گا' اب مجھے چادر اوڑھنے کی عادت ہو چکی تھی اور پھر شام کو بازار جا کر میں ایک کالی چادر لے ہی

آیا۔ اسے اپنی پسند کا عطر لگایا لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی وہ مجھے پسند نہ آئی اور میں سوچنے لگا کہ بابا جی نے اپنی چادر مجھے ہمیشہ کے لیے کیوں نہ دے دی۔ جانے اس میں بھی کیا بھید چھپا تھا اپنے کمرے میں بیٹھا اس وقت میں یہی کچھ سوچ رہا تھا جب بابا عبدالقادر میرے کمرے میں آئے وہ بڑے ابا کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یومنہ کو اسٹیشن تک چھوڑ آنے کے لیے میں جاؤں۔ وہ بڑے ابا کا یہ پیغام دے کر چلے گئے تو ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی میں اپنے کمرے سے نکل کر پورچ کی جانب بڑھا تو وہاں پہنچ کر یومنہ کو دیکھتے ہی مجھے یاد آیا میں نے اسے چند روز پہلے ایک عبایا تحفتاً دیا تھا لیکن اب اسے عبایا کے بغیر دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں فقط اتنا ہی کر سکتا تھا' وہ اب سبھی سے الوداعی ملاقات کر رہی تھی۔ جب بابا عبدالقادر اس کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ وہ سامان گاڑی میں رکھ چکے تو میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور یومنہ کے میرے مدمقابل سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے گاڑی دھیرے سے آگے بڑھا دی تھی' راستہ بھر یومنہ کو چپ چاپ دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے عبایا فقط اس لیے لے کر دیا تھا کیونکہ ایسا کرنے کو میرا من چاہا تھا' میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے وہی عزت دوں جس عزت کی وہ عورت ہونے کی وجہ سے حقدار تھی' میں جو اس کے ساتھ ایک غیر محرم تھا' اگر کبھی انجانے میں ساتھ چلتے ہوئے اس کی جانب نگاہ اٹھ جائے تو میری نگاہ اس کے وجود تک نہ پہنچ پائے اور میں ہی کیا اس کے اردگرد موجود کوئی بھی شخص اس کی جانب دیکھے تو اس کی نگاہ خود ہی پلٹ جائے کہ یہ ایک باحیا باوقار مسلم عورت ہے۔

معمولی علیک سلیک کے بعد راستہ بھر ہم دونوں خاموش ہی رہے اسٹیشن پہنچ کر جو میں نے معلومات حاصل کیں تو ٹرین کی روانگی ابھی پونے دو گھنٹے تاخیر سے ہونا تھی۔ ہم لوگ کافی پہلے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ میں جو یہ معلومات لے کر واپس گاڑی کے پاس پہنچا تو یومنہ گاڑی سے نکل کر پلیٹ فارم پر موجود بھیڑ میں میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی ٹرین کی روانگی میں پونے دو گھنٹے پڑے ہیں۔ جسے سن کر وہ کچھ سوچنے لگی تھی اور میں قریب کھڑا سمجھ گیا تھا کہ میری بات سن کر وہ شش و پنج میں پڑی یہی سوچ رہی ہوگی کہ اب اتنا وقت جو وہ مجھے پہلے ہی اسٹیشن لے آئی تھی' تو مجھے اس کے ہمراہ خواہ مخواہ میں ہی انتظار کرنا پڑے گا۔ اسے تا حال خاموش دیکھ کر میں خود ہی بول پڑا کہ میں اسے گاڑی میں بٹھا کر گاڑی روانہ ہونے تک یہاں سے کہیں نہیں جانے والا' میری یہ بات سن کر جیسے وہ کچھ اچھا محسوس کرنے لگی تھی پھر ہم دونوں ہی پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والوں کے لیے لگے بینچ کی جانب بڑھے اور پھر جس بینچ پر ہم بیٹھے تھے وہاں پہلے سے ہی ایک معمر شخص بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ بینچ پر پانچ' چھ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اب ہم تینوں ہی یوں بیٹھے تھے جیسے امتحان کے وقت استاد بچوں کے درمیان فاصلہ چھوڑ کر بٹھاتے ہیں۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں سامان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کرتے قلی بھی میری توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے اور میرے ساتھ بیٹھی یومنہ بھی شاید اسی بھیڑ کا مشاہدہ کر رہی تھی جب پھر کسی جانب سے ایک عبایا پہنے ہوئے لڑکی ہمارے پاس آئی' اور وہ معمر شخص جو ہمارے قریب چپ چاپ بیٹھا تھا' وہ اس کا ایک ہاتھ تھامے اسے اپنے ساتھ لے گئی اور میں انہیں دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ جب یومنہ کی آواز میرے

کانوں سے ٹکرائی۔

''طٰہٰ آپ یہی سوچ رہے ہوں گے ناں کہ میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا نہیں پہنا۔'' میں اس کی بات پر جس قدر حیران ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اب اسی قدر متجسس ہو کر اس کی اگلی بات سن رہا تھا۔

''دراصل میں اب تک زندگی کو جیسے جیتی آئی ہوں' میں نے کبھی ایسے کچھ سوچا ہی نہیں' زندگی میں ٹھہرنے کا ایسا سوچنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور میں دعا کرنے لگا کہ یومنہ اللہ آپ کو کبھی کسی آزمائش میں نہ ڈالے کہ آپ کو زندگی میں ٹھہر جانا پڑے' وہ رب العزت آپ کو سبھی کچھ عطا کر دے بن مانگے۔'' میں اس کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا اور وہ پھر سے مجھ سے مخاطب تھی۔

''طٰہٰ میں آپ سے جاننا چاہتی ہوں کہ ایسا آپ کی زندگی میں کیا ہوا تھا؟ جس نے آپ کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ آپ ہمیشہ سے تو ایسے نہ تھے' آپ سے کوئی شخص بھی ایک بار مل لینے کے بعد یہ ضرور سوچے گا کہ آپ بہت الگ ہیں۔'' یومنہ بولتی رہی اور اس کی باتیں سن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اردگرد کوئی تیز آندھی چلنے لگی تھی۔ جس میں اڑ رہے اوراق میرے ماضی کے مختلف ادوار تھے اور پھر میرے لب ہلنے لگے جن سے نکلتی مدھم آواز کو سننے کے لیے یومنہ مجھ سے ذرا اور قریب آ چکی تھی۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس روز خوب بارش ہو رہی تھی۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی اور کہنے والے کہہ رہے تھے کہ ہمارے خاندان کی ہر شادی پر موسم ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ غلام مصطفیٰ عالم کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ عبیرہ کی سالگرہ پر ماں اور ابا کی ملاقات ایک ایسے خاندان سے ہوئی تھی جو انہیں ہر لحاظ سے اپنے شایان شان لگا تھا۔ لڑکی کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹی تھی اور ماں کو ایسی ہی بہو کی تلاش تھی جو انگریزی خوب جانتی ہو اور جب وہ اپنی ہم عصر خواتین سے اسے ملائیں تو وہ اپنی انگریزی سے انہیں خوب مرعوب کر سکیں۔

ہم لوگ جو بے موقع اپنے لیے جشن کا سامان ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ اب ایسے ہی موقعوں پر ایسی ہی راتوں میں تو ہمارے خزانوں کے بند منہ کھلتے تھے۔ پیٹیاں بھر بھر کے پیسہ صرف آج کی رات رقص پیش کرنے والیوں پر نچھاور کرنے کو لایا گیا تھا۔ آتش بازی' دیسی ولایتی سبھی کے لیے سبھی قسم کے انتظامات پورے تھے۔

لیکن ان سبھی قسم کی فضولیات سے اگر کوئی واحد نہ خوش تھا تو وہ فقط بڑے ابا تھے۔ وہ میرے ابا کو بلا کر ایک طرف لے گئے اور انہیں سمجھانے لگے کہ یہ بھی قسم کی بیہودگی ہمارے رسم و رواج نہیں' لیکن ابا کہاں ان کی بات سننے والے تھے۔ الٹا انہیں سمجھانے لگے کہ اب ان کا زمانہ نہیں رہا۔ عین اسی وقت رقص و سرور کی محفل اپنے عروج پر تھی۔ میں نے جو مست ہو کر کسی رقص پیش کرنے والی کا بازو تھاما تو دوسرے ہاتھ سے نوٹوں کی ایک گڈی ہوا میں اچھال دی۔ روپوں کی برسات ہونے لگی تھی۔ ایک برسات باہر تھمنے کا نام نہ لے رہی تھی تو دوسری برسات ہم لوگوں نے روپوں کی کر رکھی تھی۔ دفعتاً میری نظر ایک طرف کھڑے بڑے ابا پر پڑی وہ میرے ابا کو ابھی تک مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ انہیں یہ فضولیات بالکل پسند نہ تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ خورشید عالم میرے ابا یہ سب ناچ گانا بند کروا دیں۔ میں ایسے ہی مست ماحول میں جھومتا وہاں پہنچا اور بڑے ابا جو برابر میرے ابا کو سمجھانے کی کوشش

کررہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ میں کب وہاں پہنچا اور پھر میں نے جو انہیں عقب سے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تو اب وہ چھڑانے کی کوشش میں مجھے سنانے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر پاس کھڑے میرے ابا زوردار قہقہے لگانے لگے تھے پھر میں بڑے ابا کو اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد کرکے اب انہیں اپنے ساتھ جھومنے گانے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ بھی اپنے بڑے پوتے کی شادی پر کس قدر خوش تھے‘ ان کا سارا غصہ‘ ساری خفگی ظاہراً ہی تھی لیکن پھر وہ مجھے بھی سمجھانے لگے تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جاکر گھر کے اس خاص حصے میں چھوڑ آیا جہاں انہی کی ٹائپ کے سنجیدہ حضرات بیٹھے ہم آج کی نسلوں پر گفتگو فرمارہے تھے۔ میں فوراً ہی وہاں سے پلٹا میرے سبھی دوست احباب اس طوفانی موسم کی پروا کیے بغیر پہنچ چکے تھے لیکن ان سبھی کے بیچ میں خود کو تنہا محسوس کررہا تھا‘ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبیرہ ابھی تک نہ پہنچی تھی اور پھر مجھے کسی سے معلوم پڑا کہ داؤد بھی ابھی تک نہ پہنچا تھا۔ یہ جان کر مجھے کچھ عجیب بے چینی کا احساس ہونے لگا کچھ دیر پہلے ہی عبیرہ سے میری بات ہوئی تھی‘ اس کا کہنا تھا کہ بارش کے تھمتے ہی وہ چلی آئے گی اور جب میں نے اس سے داؤد کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ وہ نہیں جانتی کہ داؤد ابھی تک کیوں نہیں پہنچا پھر میں نے جو داؤد کا نمبر لگایا تو وہ بھی مسلسل آف جارہا تھا۔ اب میں نے سبھی قسم کے غلط خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پھر سوچا کہ بہت ہوگیا اب یہ سب میں عبیرہ کو خود لینے جاؤں گا‘ اور یہ سوچتے ہوئے میں گاڑی بھی اسٹارٹ کرچکا تھا اور گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب عبیرہ کی کال آگئی۔ میں نے جھٹ کال ریسیو کی اور پھر ساتھ ہی میں نے گاڑی کا انجن بند کردیا۔ اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ آج نہیں آپائے گی‘ یہ سنتے ہی میں گاڑی سے اترا تو ایک لات رکھ کے گاڑی کو رسید کی تو جیسے میں اس طرح سے اپنا غصہ قابو میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ اب پھر سے غلط قسم کے وسوسے میرے ذہن میں یلغار مچانے لگے تھے۔ عین اسی لمحے اندر ہال میں گلوکارہ نے جو نیا شوخ سا گانا شروع کیا تو وہاں لگی بھیڑ کی اونچی سیٹیوں اور شور کی آوازیں باہر پورچ تک سنائی دے رہی تھیں۔ میں وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہال میں پہنچا اور پھر مست منچلوں کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں سے کیسے ایک بوتل میرے ہاتھ لگ گئی اور پھر میں نے اسے منہ سے لگالیا۔ ہوش میں تو میں پہلے ہی نہ تھا اور میرے ابا بھی نہ تھے‘ ورنہ بڑے ابا کو بھلا ہمیں یوں سمجھانے بجھانے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ہوش میں ہوتے تو کیا یوں لاکھوں روپیہ ناچنے والیوں پر نچھاور کرتے اگر حواس قائم ہوتے تو کیا گھر جیسے پاکیزہ ماحول میں ننگے سر اور بدن والی عورتوں کو نچاتے اور اب پی لینے کے بعد ہوش سے ہی نہیں ہوش وحواس سے بے گانہ ہوکر میں کبھی کسی رقاصہ کا بازو تھام لیتا تو کبھی کسی کے ہمراہ رقص کرنے لگتا تو کبھی مجھے اپنے ساتھ ناچ رہی رقاصہ عبیرہ دکھائی دینے لگتی اور میں یوں کھل اٹھتا جیسے عبیرہ آگئی ہو اسے یہ احساس ہوگیا کہ طہٰ عالم اسے کتنا مس کررہا ہے اور وہ بھری برسات میں اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود میری خوشی کی خاطر چلی آئی ہو اور اب ناچ ناچ کر مجھ پر فدا ہوئی جارہی ہو نشے نے بری طرح سے مجھ سے میرے ہوش وحواس سلب کررکھے تھے۔

اب میں جو سامنے ناچ رہی رقاصہ کو عبیرہ سمجھ

رہا تھا تو اسی خوش فہمی میں لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ جھوم رہا تھا پھر جیسے ہی وہ میرے وجود سے آ لگی میں نے اس کا بازو تھام لیا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا' ہال سے نکلتے ہی کمروں کی لمبی قطار شروع ہو چکی تھی۔ یہ ہال اور ملحقہ کمرے ہمارے محل نما گھر کا مہمان خانہ تھا۔ میں اسے ساتھ لیے راہداری میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا' ایک کمرے کے ہینڈل لاک کو گھمایا وہ بند تھا۔ میں اگلے کمرے کی جانب بڑھا ہینڈل گھمایا اور وہ یوں کھلا کہ میں گرتے گرتے سنبھلا۔ کسی عقبی روشندان سے کمرے میں روشنی آ رہی تھی اور ویسے بھی اب میں ہوش میں ہی کہاں تھا کہ لائٹ آن کرتا۔

صبح جو میری آنکھ کھلی تو بستر پر میں فقط تنہا ہی تھا۔ نشہ اتر چکا تھا' لیکن لباس پہنتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ عبیرہ اگر میرے ساتھ تھی تو پھر وہ ابھی کہاں ہے؟ لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا وہ رات ہماری طرف آئی ہی کب تھی' یہ بات مجھے گھر کے ملازم سے پتہ چلی تو اب میں اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ رات بھر میرے ساتھ میرے بستر پر جو تھی وہ عبیرہ نہیں تھی۔ مجھے اپنے آپ پر ہی نہیں عبیرہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے کئی روز تک میں نے اس سے بات کرنا ترک کر دیا تھا اور جب شادی کی سبھی رسومات اختتام پذیر ہو چکی تھیں' ایک روز داؤد اپنی جیپ پر میرے گھر آ پہنچا۔ عبیرہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ میری عبیرہ کے ساتھ چل رہی ناراضگی کو لے کر ہمارے درمیان صلح کروانا چاہتا تھا۔ مجھے داؤد سے کسی بھلے کی امید تو نہ تھی لیکن آج جب وہ میرے اور عبیرہ کے درمیان صلح کروانے کی غرض سے آیا تھا تو مجھے وہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ میں جو ایک پل بھی عبیرہ کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا آج تین' چار روز سے میں نے اس سے بات تک نہ کی تھی' مجھے بھی بس ذرا بہانے کی تلاش تھی۔ داؤد جیسے پہلے سے ہی پروگرام بنا کر آیا تھا۔ ہم تینوں گھر سے نکلے راستے میں دو ایک اور دوستوں کو ساتھ لیا اور ہمارے فارم ہاؤس جا پہنچے۔

فارم ہاؤس پہنچتے ہی سبھی نے پول میں چھلانگیں لگا دیں اور میں عبیرہ کو لے کر ایک طرف کو چل پڑا۔ آج کتنے ہی دنوں بعد ہم ایک ساتھ تھے اور بالکل خاموشی سے ایک ساتھ چل رہے تھے۔

''عبیرہ''

''ہوں'' وہ میرے آواز دینے پر چونکی۔

''کیا سوچ رہی ہو تم عبیرہ؟'' اس کے یوں چونکنے پر میں نے سوال کیا۔

''نہیں تو...... کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فقط اتنا ہی جواب دے پائی تھی۔

''بھائی کی شادی تو اب ہو گئی' اب بچا ہوں میں تو کس روز لینے آؤں تمہیں بینڈ باجے کے ساتھ۔'' میں نے ایک دم سے رکتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آ کر پوچھا۔ وہ میری بات سن کر نہ تو خوش ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی جواب دیا۔ وہ مجھے یونہی کھڑا چھوڑ کر ایک قدم آگے بڑھ گئی اور میں بھی پلٹ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم لوگ اب چلتے چلتے کافی آگے نکل چکے تھے۔ تب اس کی خاموشی اور بے اعتنائی پر مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا اور میں پھٹ پڑا۔ ''عبیرہ'' میں نے بلند آواز سے اسے پکارا۔ وہ ششدر سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ جب میں نے اپنی بات مکمل کی ''تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟''

''طٰہٰ یہ تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو۔'' میرے غصے سے چلانے پر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں آگے بڑھا اور اپنے غصے پر قدرے قابو پاتے ہوئے میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں جھانکنے کی کوششیں کی۔

''عبیرہ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ جب ہم دونوں ہی راضی ہیں تو پھر شادی میں دیر کیسی؟'' وہ میری بات سن کر مجھ سے نگاہیں چرا گئی اور مجھ سے قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''طٰہٰ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو تمہیں وجہ بتانا پڑے گی عبیرہ۔''

''آخر کو کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بولو......'' میں نے ایسا گرج دار آواز سے کہا اس پل مجھے نہ جانے کیا ہو رہا تھا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا یا زمین میرے پیروں تلے سے کھسکنے لگی تھی جب اس نے اپنا کھرا سا جواب بھی سنا دیا۔

''میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ فقط اتنا کہہ کر واپسی کے لیے پلٹ گئی اور میں وہیں ساکت کھڑا حیرت زدہ سا اپنے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب کھوج رہا تھا کہ آخر کو وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ میرے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب بھی فقط وہی دے سکتی تھی جو یہ کہہ کر پلٹ گئی تھی کہ وہ جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ میں کچھ دیر وہیں حیرت سے مجسمہ بنا کھڑا رہا اور پھر اسے کافی آگے نکلتا دیکھ کر میں بھی پیچھے چل پڑا۔

جب میں سبھی کے پاس پہنچا تو وہ اس وقت شرارتوں میں مگن تھے۔ میں چپ چاپ اس کے پاس سے گزر جانا چاہتا تھا جب داؤد نے مجھے آواز دی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پول میں فٹ بال کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا اور عبیرہ بھی پیروں کو پول میں لٹکائے وہیں کنارے پر بیٹھی تھی۔ میں داؤد کو کوئی بھی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔ جب کبھی میں بے حد پریشان یا مایوس ہونے لگتا تھا یہیں اسی فارم ہاؤس آ کر ولایتی کی جگہ برانڈی پیا کرتا تھا' پول کے پاس ہی فارم ہاؤس کے ریسٹ رومز تھے میں نے اندر پہنچ کر برانڈی کی ایک بوتل نکالی اور اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

''تمہیں وجہ بتانا پڑے گی......عبیرہ؟''

''آخر کو کیا وجہ ہے بولو......؟''

میرا ہر گھونٹ پھر سے اس سے وہی سوال دہرا رہا تھا اور اس کا بھی وہی کھرا سا جواب میرے ذہن میں کسی ہتھوڑے کی ضرب بن کے برس رہا تھا۔

''میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔'' میں اس کے اس کھرے سے جواب کے بدلے خود ہی وجہ کھوجنے لگا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ برانڈی کا تیز نشہ میرے اعصاب پر چڑھنے لگا تھا لیکن میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پایا کہ اس کے ایسے رویے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ وہ جو میرے بن ایک پل نہیں رہ سکتی تھی۔ میری خواہش جاننے کے بعد خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ سبھی کو بتاتی پھرتی تھی کہ طٰہٰ عالم اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب یوں چند دنوں میں ہی ایسی کیا وجہ بن گئی تھی کہ وہ مجھ سے یوں متنفر ہو رہی تھی۔

داؤد مجھے اور عبیرہ کو یوں ایک ساتھ اس جگہ صلح کروانے کی غرض سے لایا تھا لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ یہاں آ کر ہمارے بیچ نازک سا بندھن ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگے گا۔ میں اسی رنج میں گھلتا کافی دیر سے اندر بیٹھا پی رہا تھا۔ جب داؤد میرے پاس آیا' وہ مجھے اب جلد یہاں سے واپس چلنے کا کہہ رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اب ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ میری بات سن کر چلا گیا

لیکن اس نے مجھ سے یہ تک دریافت نہیں کیا کہ آخر میں جو یہاں عبیرہ سے صلح کرنے آیا تھا اب یوں مجنوں بنا پی کیوں رہا ہوں۔ کاش! اس وقت میں نے اس بات پر ہی غور کرلیا ہوتا تو مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہوتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا لیکن خود کو سنبھال نہیں پایا اور لڑکھڑاتے ہوئے گرتے گرتے بچا۔ کمرے میں بکھری میز اور کرسیوں کا سہارا لے کر میں ایک طرف موجود الماری کی جانب بڑھا' الماری کے پاس پہنچ کر میں نے ایک ناگوار سا ڈکار لیا اور جیب سے چابی نکال کر لگائی پھر الماری کا دروازہ کھلتے ہی اس میں بنے ایک چھوٹے دراز میں سے میں نے پھر چابی لگا کر ایک ریوالور نکالا' اس میں گولیاں چیک کیں اور پھر اسے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بسا اوقات فارم ہاؤس سے نکلنے میں مجھے دیر ہو جاتی تو میں یہاں اپنی حفاظت کے لیے رکھے ریوالور کو واپسی کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا کرتا تھا۔ اب اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں جو باہر نکلا تو ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں نے دور سے ہی دیکھا داؤد ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اس کے مقابل سیٹ پر عبیرہ بیٹھی تھی۔ پچھلی جانب دو دوست بیٹھے تھے جن میں سے ایک مجھ پر نظر پڑتے ہی جیپ سے کود کر میری جانب بڑھا تو اس کا ایک بازو تھامے میں آگے بڑھا' میرے جیپ میں بیٹھتے ہی داؤد نے جیپ آگے بڑھادی تھی۔ راستہ بھر بھی آج فارم ہاؤس میں بتائے دن پر تبصرہ کرتے رہے داؤد کے قہقہے سب سے زیادہ بلند تھے اور میں نشے میں دھت ابھی تک اسی وجہ کو تلاش کرنے میں مگن تھا جو عبیرہ مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔

میں اکثر اس کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا تھا وہ بھی مجھے میری طرح چپ چاپ کھوئی کھوئی سی بیٹھی دکھائی دی۔ اب جیپ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے ہو کر گزر رہی تھی۔ ہم لوگ نصف سے زائد سفر طے کر چکے تھے۔ رات کے سوا دس ہو رہے تھے اور ان چھوٹے چھوٹے قصبوں کی سبھی دکانیں تقریباً بند ہو چکی تھیں۔

میں اب تک کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ آخری سگریٹ کو پھینکتے ہوئے میں نے ایک اور سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور جو لائٹر کو جلانے لگا تو اب اس کا کمزور سا شعلہ سگریٹ کو سلگانے کے لیے نہ کافی ثابت ہوا۔ میں نے غصے سے لائٹر ایک جانب ہوا میں اچھال دیا لیکن کسی اور کے پاس بھی اس وقت کوئی ماچس یا لائٹر نہ تھا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور پھر ایک جگہ روشنی دیکھ کر میں نے داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا' میں اس کی عقبی جانب اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا' اس نے جیپ دکان کے بالکل قریب سامنے لے جا کر کھڑی کردی۔

میں جیپ کے رکتے ہی نیچے اترا ایک دوست مجھے سہارا دینے کے لیے اترنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ میں دکان کی جانب بڑھا دکانوں کی لمبی قطار میں فقط وہ پہلی دکان ہی کھلی پڑی تھی۔ دکان کے سامنے بنے برآمدے کی ملگجی روشنی میں جو میں آگے بڑھا تو مجھے دیکھ کر دکان میں موجود شخص اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سر پر سفید جالی دار ٹوپی چہرے پر سنت کے مطابق داڑھی' سفید لباس پہنے وہ چوبیس پچیس سالہ جوان شخص تھا' اور اس وقت اس کے ہاتھ میں قرآن تھا' جسے میرے سامنے ہی اس نے چوم کر آنکھوں سے لگا کر ایک جانب رکھا اور میری جانب متوجہ ہو کر دیکھنے لگا۔ میں کاؤنٹر کے

قریب پہنچا اور جیسے ہی میں نے بولنے کے لیے لب کھولے اس نے میرے منہ سے آتی شراب کی ناگوار بو کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی اس حرکت کی پروا کیے بغیر میں نے اسے کہا کہ مجھے ماچس یا لائٹر چاہیے یہ سن کر اس نے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹایا اور یوں غصے اور حقارت سے ایک ہاتھ آگے بڑھا کر جیسے اس نے مجھے دھتکارتے ہوئے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اس کا وہ ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے ایسا کہنے کی دیر تھی کہ میں پھر اپنے آپے میں نہ رہا' میری دماغی حالت جو پہلے ہی ابتر تھی اس کی اس حرکت نے مجھے جیسے پاگل بنا کے رکھ دیا اور میں نے اگلے ہی پل جیب میں رکھے ریوالور کو نکالا اور اس پر گولی چلادی۔

گولی کے چلتے ہی وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر جا گرا اور میرا ہاتھ جیسے ابھی تک وہیں ہوا میں ہی معلق تھا۔ جب عبیرہ کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی میں نے پلٹ کر دیکھا داؤد جیپ اسٹارٹ کرچکا تھا' میں تیزی سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جیپ کی جانب بڑھا۔ ابھی میں نے بامشکل چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ داؤد جیپ لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے انہیں آواز دینا چاہی لیکن آواز جیسے میرے حلق میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔ میں جیپ کے پیچھے دوڑا وہ چند لمحوں میں ہی مجھ سے بہت آگے دور نکل چکے تھے۔ میں کچھ آگے جا کر وہیں ٹھہر گیا اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی گولی کی آواز سننے کے باوجود ابھی تک وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ چارسو پھیلی چاند کی چاندنی میں' میں نے سر گھما کر دکان کی جانب دیکھا وہاں کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر ڈھیر وہ اجنبی جوان پڑا تڑپ رہا ہوگا یا مرچکا ہوگا' ایسا میں نے فقط سوچا' وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ ٹکائے آگے بڑھتی شاہراہ کی جانب سر کو اٹھائے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں انہیں آوازیں دے رہا تھا۔

''داؤد...... عبیرہ...... واپس آجاؤ......'' وہ جو مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہیں واپس کب آنا تھا اور میں تاحال اسی دکان سے چند گز کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس دکان تک پہنچتا مجھے اب یہاں سے بھاگنا تھا۔ پہلے جس نشے نے میرے حواس سلب کر رکھے تھے' میرے ہاتھ سے یوں گولی کے چل جانے اور داؤد اور عبیرہ کے مجھے بے یارومددگار چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد گویا میرے چودہ طبق روشن ہوچکے تھے۔ میرا نشہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں اٹھ کر وہاں سے سرپٹ بھاگنے لگا لیکن مجھے جانا کہاں تھا یہ سوچ کر کچھ آگے جا کر میں پھر سے ٹھہر گیا تھا۔ اب دکان کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ ایسے قصبے سرشام ہی ویران ہوجاتے تھے۔ یہاں سے کسی قسم کی کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی اور شہر یہاں سے میلوں دور تھا۔ گھر جانا بھی مناسب نہ تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی میں نے یہ سوچ کر اردگرد نگاہ دوڑائی پاس ہی ایک دیوار پر کسی اشتہار کے ساتھ وسن پورہ لکھا تھا۔ وسن پورہ میرے ذہن میں ایک دم سے جھماکا سا ہوا۔ مائیکل ہمارا ڈرائیور بھی تو اسی قصبے وسن پورہ کا رہائشی تھا۔ میں کئی بار اسے یہاں اس کے گھر سے لینے آیا تھا۔ یعنی آج رات میں مائیکل کے گھر گزار سکتا ہوں ایسا سوچتے ہی میں دائیں بائیں مڑ کر اس جگہ کی شناخت کرنے لگا۔ مائیکل کے گھر اس کی گلی میں داخل ہونے سے پہلے بجلی کا ایک بڑا کھمبا آتا تھا' یہ یاد آتے ہی میں بجلی کے تاروں کے ساتھ ساتھ

چلنے لگا۔ دور الیون کے ڈی کے بڑے سے کھمبے کے ساتھ ایک برقی قمقمہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اس برقی قمقمے کے عین نیچے جا پہنچا تھا۔ میں نے اک نظر سر اٹھا کر دیکھا اس پر ایک عبارت کندہ تھی۔ ''خورشید عالم ایم این اے'' یعنی میں ابا کے حلقہ کی حدود میں ہی تھا۔ میں نے سامنے نگاہ اٹھا کر دیکھا سامنے وہی گلی دکھائی دے رہی تھی جس میں مائیکل کا گھر تھا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا' چار سو ویرانی سی ویرانی چھائی تھی۔ کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط چند گز کے فاصلے پر کنٹونمنٹ بورڈ کے رکھے بڑے کچرادان کے پاس چند کتے بھونک رہے تھے۔ میں آہستہ سے چلتا ہوا تنگ و تاریک سی گلی میں اتر گیا۔

لیکن اندر گلی میں موجود گھروں میں سے مائیکل کا گھر کونسا تھا؟ اب اس بات نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں فقط دو ایک بار ہی اسے چھوڑنے یا لینے آیا تھا اور ایک بار اس کے ضد کرنے پر میں اس کے گھر چائے پینے آیا تھا۔ اس وقت دن تھا اور اب رات' اور میں کسی کا قتل کر کے پناہ ڈھونڈنے آیا تھا۔ گھبراہٹ میں' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا' دو چار گھر چھوڑ کر ایک گھر کے دروازے کے سامنے میں رک گیا۔ گھر کھوجنے میں مجھے جس قدر دشواری پیش آ رہی تھی' اب اس سے کئی گنا کٹھن مجھے دروازے پر دستک دینا محسوس ہو رہا تھا۔ میں دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاتا اور ہاتھ مجھے یوں منوں بھاری ہوتا محسوس ہوتا اور پھر دروازے پر دستک دیئے بغیر ہی میں ہاتھ نیچے لے جاتا' اسی کشمکش میں کچھ وقت مزید گزر گیا۔ پھر ہمت جتا کر میں نے دستک دے ہی دی اور میری سوچ کے برعکس میری پہلی ہی دستک پر مجھے اندر سے کئی قسم کی ملی جلی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ میں نے دوسری بار دستک نہ دی' میں وہیں کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ مائیکل ابھی آ کر دروازہ کھولے گا' جب دروازے کی کنڈی کھلتے ہوئے مجھے اندر سے آواز سنائی دی۔ ''ذرا رکنا اجمل پتر...... کئی بار کہا ہے اسے گریس دے دو' کتنا دشوار ہو گیا ہے اسے کھولنا۔'' کنڈی کے کھلتے ہی سامنے کھڑے بزرگ شخص نے جیسے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میں نے غلط گھر کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ میں جیسے اپنی غلطی سدھارنے کے لیے جھٹ سے بولا۔ ''باباجی کیا یہ مائیکل کا گھر ہے؟''

''نہیں بیٹا' مائیکل کے گھر کا دراوزہ تو یہ ساتھ والا ہے۔'' باباجی نے گھر کی دہلیز سے چند قدم آگے آتے ہوئے کہا۔

''معذرت بیٹا' میں سمجھا میرا بیٹا اجمل آیا ہے۔'' میں آگے بڑھ چکا تھا جب میرے عقب سے باباجی کی آواز مجھے سنائی دی۔ معذرت تو مجھے کرنا چاہیے تھی جو یوں رات کے اس پہر دروازے پر دستک دے کر انہیں تکلیف دی' لیکن میں اس وقت جیسی کشمکش میں مبتلا تھا میں ان باتوں کا بھلا کیا لحاظ کرتا اب میں مائیکل کے گھر کے دروازے سے باہر کھڑا تھا' میں نے جھٹ سے دروازے پر دستک دی اور پھر دوسری تیسری چوتھی دستک کے بعد جو مائیکل نے دروازہ کھولا تو میں دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ عین اسی لمحے جب میں فوراً اندر داخل ہوا تھا وہ مجھے پہچان نہیں پایا اور گھبرا کر وہ میری طرف مڑا۔ دروازہ ابھی کھلا ہی تھا' یہ دیکھ کر میں نے پلٹ کر دروازہ خود ہی بند کر کے اسے کنڈی لگا دی۔

''چھوٹے صاحب آپ؟ اس وقت؟ اتنی رات کو؟'' وہ مجھے پہچان گیا تھا اور اب حیران ہو کر اس

نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔ اسی دوران اندر سے اس کی بیوی کی آواز آئی۔

''کون ہے مائیکل؟'' رات کے اس پہر دروازے پر ہونے والی دستک سن کر مائیکل کے بیوی بچے بھی جاگ گئے تھے۔ میں نے ایک نظر اندرونی دروازے کو دیکھ کر مائیکل کو کاندھوں سے پکڑے اسے اپنے سے ذرا قریب کرلیا تھا۔

''مائیکل مجھ سے خون ہوگیا ہے۔''

''کیا بولا صاحب۔'' مائیکل کو جیسے میری بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ میری بات سن کر اب کچھ خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''صاحب کیسے ہوا یہ سب؟'' اس سے پہلے کہ میں اسے مزید کچھ کہتا وہ کانپتا ہوا اردگرد دیکھنے لگا اور بولا چلو صاحب اوپر چلو۔'' وہ مجھے ایک طرف لگی تنگ سی سیڑھی کی طرف لے گیا۔ سیڑھی اوپر ایک کھلی چھت سے جڑی تھی اور اس سے آگے ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ مائیکل مجھے بنارکے اس کمرے میں لے گیا' اندر پہنچتے ہی اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اندر ایک بیڈ پڑا تھا۔ مائیکل کے کہنے سے بھی پہلے میں بیڈ دیکھ کر یوں اس پر جا ڈھیر ہوا گویا میلوں کی مسافت سے ابھی لوٹا تھا۔ پھر مائیکل بھی جیسے میری ذہنی حالت کو سمجھ چکا تھا۔ میرے لیٹتے ہی وہ میری ٹانگیں دابنے لگا' لیکن مجھے اس کے ایسا کرنے سے راحت کہاں ملنے والی تھی۔ میں نے اسے منع کردیا۔ وہ جھٹ سے اٹھا۔

''صاحب آپ کو بھوک لگی ہوگی میں ابھی کھانا تیار کرواتا ہوں۔ صاحب اب آپ ادھر محفوظ ہیں۔ مائیکل ہے ناں آپ کو کسی قسم کی فکر نہیں کرنا۔'' وہ مجھے تسلی دے کر چلا گیا لیکن مجھے اس کے کہے چند بول بھی میری دلجوئی کے لیے بہت بڑے محسوس ہوئے۔ ہاں میں بہت برا تھا' ہر طرح ہر قسم کے گناہوں کا عادی تھا لیکن میں نے آج سے پہلے کسی انسان کا قتل نہیں کیا تھا۔ کسی کی جان نہیں لی تھی اور اب میں ایک بے گناہ معصوم انسان کو یوں موت کے گھاٹ اتار کر یہاں سکون سے بیٹھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بے تاب ہوکر اٹھ بیٹھا۔ داؤد نے جو میرے ساتھ کیا تھا وہ بھی میرے لیے کس قدر اذیت ناک تھا۔ میرے ہاتھ سے گولی چل جانے کے بعد بجائے اس کے وہ مجھے خود وہاں سے گاڑی میں اپنے ساتھ کسی محفوظ جگہ لے جاتے داؤد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مجھے وہیں بے یارومددگار چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ عبیرہ بھی تو اس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ گولی چلتے ہی عبیرہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ میں نے سنی تھی۔ شاید وہ میرے یوں اچانک گولی چلانے پر اور سامنے موجود آدمی کے سینے سے پھوٹتے خون کے فوارے کو دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی تھی۔ داؤد کے گاڑی آگے بڑھاتے ہی میں ان کے تعاقب میں دوڑا بھی تھا کہ ہوسکتا ہے داؤد آگے جا کر گاڑی روک دے یا عبیرہ' داؤد کو واپس چلنے کو کہے اسے کہے کہ ہمیں طٰہٰ کو یوں بے یارومددگار چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے اس کی مدد کو چلنا چاہیے لیکن ایسا نہیں تھا' اگر ایسا ہوتا تو میں وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا' جس سمت وہ جیپ لے کر گئے تھے اسی راستے پر چل کے میں مائیکل کے گھر تک آیا تھا لیکن داؤد جیپ لے کر واپس نہیں آیا تھا لیکن میرا دل یہ بات بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ عبیرہ بھی داؤد کے ساتھ مل چکی ہوگی۔ ایسے ہی کئی طرح کے خیالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے جب مائیکل اندر داخل ہوا اس نے پانی کا گلاس میری جانب بڑھایا میں نے چند گھونٹ پی کر اسے ایک طرف رکھ دیا اور وہ یہ کہہ کر کہ وہ کھانا لے کر آتا ہے پھر سے واپس چلا گیا۔

مائیکل کے جانے کے بعد اور پانی پی لینے کے باوجود مجھے کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے میں کمرے سے نکلا کمرے کے سامنے کا کھلا حصہ اس گھر کی چھت تھا اور کمرے کے سامنے جیسے چھوٹا سا صحن نما حصہ تھا۔ جس میں ایک جانب چند گملے پڑے تھے۔ کمرے کی مخالف سمت سامنے اونچی جالی دار سیمنٹ کی دیوار تھی۔ شاید اس دیوار کو بھی چھت ڈالنے کے لیے اوپر تک تعمیر کر دیا گیا تھا اور اس دیوار کے عین نصف حصے میں سیمنٹ کی بنی جالی ہوا کی آمد و رفت کے لیے لگا دی گئی تھی۔

جالی دار دیوار میں سے چاند کی چاندنی کا عکس چھت پر بھی ایک جالی کی دیوار بنا رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور جالی دار دیوار کے پاس ہی نیچے بیٹھا سوچنے لگا کہ وہاں اس دکان پر کوئی شخص آیا ہوگا' اسے کوئی چیز خریدنا ہوگی لیکن جب اس نے خون سے لت پت لاش پڑی دیکھی ہوگی تو فوراً پولیس کو اطلاع کر دی ہوگی یا ہوسکتا ہے وہ اس دکان والے شخص کو پہچانتا ہو اور فوراً وہ ان کے گھر تک پہنچا ہو اور پھر اس گھر کے مقیم لوگوں کو وہ منحوس خبر سنائی ہو کہ ان کا بیٹا اب نہیں رہا اور جب نئے دن کا سورج طلوع ہوگا تو سبھی نیوز چینل پر یہ پٹی چل رہی ہوگی کہ ایک سیاسی رہنما کے بیٹے نے ایک جواں سالہ شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا' یوں ابا کا سیاسی کیریئر میری وجہ سے داغ دار ہو جائے گا اور پھر صرف پولیس ہی نہیں بلکہ میرے ابا بھی میری تلاش شروع کر دیں گے۔ وہ جو اپنے ہر عیب اور جرم پر یوں پردہ ڈال لیتے تھے کہ دنیا کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی' وہ میرے سر عام قتل پر مجھے کبھی معاف کرنے والے نہ تھے۔

لیکن مجھے تو وہاں گولی چلاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور یہ طے تھا کہ داؤد' عبیرہ یا میرے دوستوں میں سے کوئی بھی اس حادثے کے بارے میں کہیں کچھ بتانے والا نہ تھا پھر پولیس کو مجھ تک پہنچنے کے لیے کوئی ثبوت بھی تو درکار ہوگا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں اگلے ہی پل ایک دم سے اچھل پڑا اور کھڑے ہو کر اپنی پینٹ کی ساری جیبیں کھنگالنے لگا لیکن ریوالور جہاں گرا تھا' میں اسے وہاں سے اٹھانا بھول گیا تھا اور اب بے بسی اور حیرت کی تصویر بنا میں پھر سے پاؤں پسار کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو جیسے بے جان سا ڈھیلا چھوڑ دیا جب عین اسی وقت میرے کانوں سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔

''امی! آج اجمل بھائی کہاں رہ گئے' اتنی دیر تو انہیں کبھی نہیں ہوئی۔'' یہ بات سن کر میں نے بیٹھے بیٹھے سر کو گھما کر دیکھا' سیمنٹ کی جالی دار دیوار سے بالکل نیچے ساتھ والے گھر کا آنگن چاند کی مدھم روشنی میں دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے مائیکل کے گھر آنے سے پہلے غلطی سے اسی گھر کے دروازے پر دستک دی تھی اور اس وقت بھی ایک کمزور بوڑھے بابا جی مجھے اجمل سمجھ رہے تھے پھر میری نظریں ابھی اس صحن سے ہٹی ہی تھیں کہ مجھے زور زور سے اسی جانب دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ کوئی زور زور سے ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے اسی جانب پھر دیکھتے ہوئے سوچا کہ لگتا ہے' اب اجمل ہی ہوگا جس کا اس گھر بھر کو انتظار ہے۔ میں نے دیکھا وہی کمزور سا بوڑھا شخص دروازے کی جانب بڑھا پھر کوئی لڑکی پیچھے سے دوڑی آئی۔

''ابا آپ دروازہ کھولنے میں بہت دیر کر دیتے ہیں' بھیا ہوگا میں کھولتی ہوں۔'' لڑکی کی بات سن کر بوڑھا شخص وہیں صحن کے وسط میں رک گیا۔ لڑکی دروازے کی جانب بڑھی' وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

''ایک تو اتنی دیر کر دی آنے میں اوپر سے ذرا صبر نہیں ہو رہا' اچھا بھئی صبر کھولتی ہوں۔'' لڑکی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی پیچھے ہٹ گئی۔

''کوئی سیانا گھر پر ہو تو بیٹی اسے بلاؤ۔'' کوئی ادھیڑ عمر آدمی تھا' صحن میں کھڑے بوڑھے شخص نے باہر کھڑے شخص کی آواز سن لی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا آگے بڑھا' باہر کھڑا شخص انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر چند قدم آگے چلا آیا۔

''چاچا آپ ہی اجمل کے ابا ہیں...... چاچا...... حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے۔ چاچا تیرا اجمل...... وہ جیسے کہتے کہتے رک گیا۔ فاصلہ کچھ اتنا کم تھا کہ ان کے درمیان ہو رہی ساری باتیں مجھے واضح سنائی دے رہی تھیں۔ چاچا حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے' باہر کھڑے شخص کے یہ الفاظ سن کر جیسے میرے نیچے اوپر کا سانس وہی رک گیا تھا۔ پھر باہر کھڑے شخص نے اپنی بات مکمل کی۔'' چاچا تیرا اجمل قتل ہو گیا ہے۔'' پاس کھڑی لڑکی نے یہ بات سنتے ہی اس زور کی چیخ لگائی کہ میرا دل دہل گیا۔

''اجمل پتر......'' اجمل کے ابا جو یہ خبر سن کر اک لمحے کو ساکت کھڑے رہ گئے تھے انہوں نے دلخراش آواز سے اپنے اجمل کو پکارا' ایک لمحے کے کچھ حصے میں اسی آنگن میں جہاں جیتے جاگتے اجمل کا انتظار ہو رہا تھا۔ کہرام مچ گیا۔ اندرونی کمروں سے چند اور خواتین صحن میں آ گئیں۔

''اماں......''

''کیا ہوا میرے اجمل پتر کو......؟''

''اماں بھائی......'' کسی پر غشی کا دورہ پڑا' صحن کے وسط میں ماں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بوڑھا باپ اور ایک لڑکی اس شخص کے ساتھ باہر کو دوڑے' گلی میں جہاں سے وہ گزر کر جا رہے تھے ان کے رونے اور چیخنے کی آوازیں دور سے بھی آتی سنائی دے رہی تھیں پھر مجھے کسی کے تیز تیز قدموں سے سیڑھی چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں جھٹ سے ذرا ایک طرف دیوار کے ساتھ چمٹ گیا۔

''مائیکل چاچا...... جلدی آئیں' مائیکل چاچا...... اجمل بھائی'' ایک لڑکی ساتھ والے صحن سے سیڑھیاں چڑھ کر جالیوں والی دیوار سے لگی زور زور سے مائیکل کو پکار رہی تھی۔ شاید مائیکل نے گلی میں رونے چیخنے کی آواز سن لی تھی اسی لیے وہ چھت پر نہیں آیا وہ دروازہ کھول کر اجمل کے ابا کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ وہ لڑکی چند ایک لمحے ہی وہاں کھڑی روتی مائیکل کو پکارتی رہی اور پھر مائیکل کے نہ آنے پر وہ الٹے پیروں نیچے کو دوڑی۔

''اماں......' اماں ہوش کر......''

''میرا پتر اجمل نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا' میرا اجمل نہیں۔''

''اماں...... بھائی...... میرے بھائی کو کچھ نہیں ہوا...... اماں...... اماں اجمل کو کچھ نہیں ہوا ابا بھائی کو لینے گئے ہیں' دیکھنا...... اماں وہ ابھی بھائی کو لے کر آ جائیں گے۔''

یارب یہ اجمل کا ہی گھر تھا۔ میں سر تھامے قدرے جھک گیا۔ رات کی تاریکی میں گونجنے والی دردناک آوازیں میری قوت برداشت سے باہر تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اجمل کے گھر کا چھوٹا سا آنگن لوگوں سے بھر گیا۔ اب تو گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے دار عورتوں کے رونے کی بلند آوازیں بھی آ شامل ہوئی تھیں۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



آخری حصہ

یارب

غلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان۔ ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔کسی برگزیدہ ہستی کی نظرکا کرشمہ۔ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔
کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔
ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گردآلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔
ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پرُ پابند رہا۔
سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن۔
آشقہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول۔

رات کے سناٹے میں یہ دردناک آوازیں اجمل کی بہنوں اور ماں کی بین کرتی آوازیں مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا یوں چپکا بیٹھا تھا کہ اب وہاں سے اٹھنے کی بھی سکت مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے لگا اگر میں ذرا سا بھی ہلا تو سبھی جان جائیں گے کہ اجمل کا قاتل بھی یہیں اس طرف چھت پر ایک کونے میں دبکا بیٹھا ہے۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے میں کوئی پتھر کا مجسمہ بن چکا تھا۔ جس میں فقط سننے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ گلی میں پھر سے شور بلند ہوا' گھر کے صحن سے خواتین باہر کو دوڑیں' چیخ وپکار آہ وبکا نے جیسے زمین وآسمان ہلا ڈالے تھے۔ میں نے اپنے منوں بھاری جھکے ہوئے سر کو بامشکل اٹھایا' تھوڑا بائیں طرف موڑا سامنے صحن میں ذرا کھڑے ہونے تک کی جگہ نہ تھی۔ صحن لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ اب کھلے دروازے سے چارپائی اندر لائی جارہی تھی۔ سبھی غش کھا کھا کر یوں گر رہے تھے کہ چارپائی کو نیچے رکھنے میں بھی کچھ وقت لگا۔ اب کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کون اپنا رو رہا ہے' اپنے پرائے سبھی یوں دھاڑیں مارے اجمل کی چارپائی کے پاس کھڑے رو رہے تھے۔

''اس معصوم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔'' کسی نے یوں درد بھری آواز سے کہا کہ مجھے اپنا کلیجہ چھلنی ہوتا محسوس ہوا۔

''میرے اجمل سے کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی تھی' بس ایک بار مل جائے پتہ تو چل ہی جائے گا میرے پتر کے سینے پر گولی چلانے والے کے سینے پر میں اپنے ہاتھوں سے گولیاں برساؤں گا اجمل...... اجمل پتر'' اجمل کے ابا غش کھا کر بے ہوش ہوگئے اور پھر جب کسی نے ان کے منہ پر پانی ڈالا اور انہیں پھر ہوش آیا تو وہ جیسے بے قابو ہوکر چلانے لگے۔

''میرے اجمل پتر' کو کچھ نہیں ہوا ہٹ جاؤ سب ہٹ جاؤ یہاں سے اجمل کی ماں تو کیوں روتی ہے کچھ نہیں ہوا تیرے اجمل کو' ثمرہ پتر' نمرہ' زاہدہ' عابدہ تم کیوں روتی ہو' تمہارے بھائی کو کچھ نہیں ہوا یہ تو سو رہا

ہے۔ دن بھر آج کام کرتا رہا ہے ناں اسی لیے سو رہا ہے۔ آرام کرنے دو اسے سب چپ ہو جاؤ...... میرے پتر اجمل کی شادی میں اب چند ہی دن تو باقی ہیں۔ پھر میرا اجمل دلہا بنے گا یوں شان سے نکلے گی اس آنگن سے اس کی بارات میں سارے ارمان پورے کروں گا۔"

"ابا...... ماں ابا کو روکو...... ابا بس کرو بھائی اب نہیں ہے۔" یہ سن کر اجمل کے ابا پر پھر غش پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس پتھر کے مجسمے کی آنکھوں سے کیوں آنسو جاری ہو گئے تھے کیا پتھر کے مجسمے بھی روتے ہیں۔ کیا وہ قاتل بھی روتے ہیں جو بے دردی سے کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ میری آنکھیں یوں برس پڑی تھیں۔

"ہاں میں سارے ارمان پورے کروں گا۔" اجمل کے ابا ہوش میں آتے ہی وہی آخری جملہ زبان سے دہرا رہے تھے۔

"یارب یہ مجھ سے کیا ہو گیا؟" اجمل کے ابا کے ارمان اب کیسے پورے ہو سکتے تھے۔ ان کی اس بات نے وہاں موجود سبھی لوگوں کو رلا دیا اور اب چند مرد حضرات بھی یوں دھاڑیں مارے رو رہے تھے۔

یارب یہ مجھ سے کیا خطا ہو گئی۔ گھر کا واحد کمانے والا' ماں باپ کا اکلوتا چراغ' چار بہنوں کا واحد بھائی میرے ہاتھوں سے قتل ہو گیا...... یارب اس گھڑی ان لمحوں میں مجھے کچھ ہو جاتا یا پھر میرے پاس ریوالور ہی نہ ہوتا اگر تھا تو اس میں' میں گولیاں ہی رکھنا بھول جاتا۔ میں آج داؤد اور عبیرہ کے ساتھ فارم ہاؤس ہی نہ گیا ہوتا اور اگر واپسی پر مجھے اجمل کی دکان کے باہر رکنا ہی پڑا تھا تو میں خود دکان پر جانے کی بجائے کسی دوست کو بھیج دیتا۔ کاش ایسا ہوتا تو آج اس آنگن میں صف ماتم نہ بچھا ہوتا۔ اجمل کے ابا کے سارے ارمان پورے ہوتے' بہنیں اپنے بھائی کا سہرا سجاتیں اور ماں خوشی سے واری جاتی۔ یارب یہ مجھ سے کیا خطاء ہو گئی۔ سر جھکائے تر آنکھوں سے میں یہی سوچ رہا تھا۔ جب مجھے احساس ہی نہ ہوا کب مائیکل میرے پاس آیا اور میرے قریب فرش پر ہی بیٹھا تھا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا اور میں نے مائیکل کی جانب دیکھا تو وہ اب مجھے پہلے جیسا نہ لگا جو ابھی چند لمحے پہلے مجھے کہہ کر گیا تھا کہ صاحب آپ کو بھوک لگی ہو گی میں ابھی کھانا لے کر آتا ہوں۔

"یہ کیا کر دیا صاحب آپ نے؟" مائیکل فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور میں نے جیسے بے تاب ہو کر مائیکل کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں نہیں جانتا مائیکل یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں نشے میں تھا اور بس پھر......" میں جیسے کہتے کہتے رک گیا۔ جب مائیکل بیچ میں ہی بول پڑا۔

"بس کریں صاحب جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا جن کا باغ اجڑنا تھا وہ تو اب اجڑ گیا۔ مائیکل نے آپ کا نمک کھایا ہے صاحب...... آپ یہاں خود کو محفوظ سمجھیں' جب گلی میں' میں نے شور اور رونے کی آوازیں سنیں تو گلی میں پہنچتے ہی میں سب سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنی بیوی کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ گھر کا دروازہ بند ہی رکھے' اب یہاں کوئی نہیں آئے گا صاحب آپ بے فکر ہو جائیں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور میں بھی سر جھکائے نیچے فرش کو گھورتا رہا جبکہ ہمارے عقب سے لگاتار رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کبھی یہ دلخراش آوازیں اتنی بلند ہونے لگتیں کہ میرا جی چاہتا میں یہاں اس جگہ سے کہیں بہت دور چلا جاؤں۔ مائیکل کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولا۔

"صاحب آپ کو بھوک لگی ہو گی' آپ کمرے میں

چل کر بیٹھیں میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔"

"مجھے کھانا نہیں کھانا مائیکل، مجھے یہی بیٹھے رہنے دو۔" مائیکل کی بات سن کر میں نے آزردہ ہو کر جواب دیا۔ مائیکل میری بات سن کر تھوڑی دیر چپ چاپ میرے پاس بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔

مائیکل کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد میں نے اپنی آنکھیں موندھ لیں اور سر کو پچھلی جانب دیوار سے ٹکا دیا۔ میرے عقب سے ابھی تک درد بھری آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ کبھی اجمل کے ابا اپنے جواں سالہ بیٹے کی میت کے پاس کھڑے یوں اپنا درد بیان کرتے کے رونے کی آوازیں شدید سے شدید تر ہوتی چلی جاتیں۔

پھر آنکھیں بند کیے دیوار سے ٹیک لگائے میں دعائیں کرنے لگا۔ یا رب یہ سب کبھی حقیقت نہ ہوا ہو، کبھی جب میں اپنی بند آنکھیں کھولوں تو اس خواب کی حقیقت سے کوسوں دور کھڑا ہوں یہ درد بھرا اذیت ناک خواب میرے لیے میرے کرتوتوں کا فقط ایک استعارہ ہو میں جاگنے پر اس خواب کو سوچوں تو کانپ اٹھوں اور کبھی پھر شراب کے پاس نہ جاؤں، کبھی یوں کسی بے گناہ معصوم انسان پر گولی نہ چلاؤں، یا رب یہ خوفناک لمحے یہ گھڑیاں حقیقت نہ ہوں۔ دفعتاً میرے عقب سے رونے کی آواز یوں بلند ہوئیں کہ جیسے زمین و آسمان ہل کے رہ گئے، شاید اجمل کے کسی رشتہ دار کو جو اطلاع ہوئی تو وہ ابھی پہنچے تھے پھر رات کے باقی حصے میں یہ سلسلہ جاری رہا، جیسے ہی کوئی اجمل کا رشتہ دار اجمل کے گھر کی گلی میں داخل ہوتا وہیں سے رونے چلانے کی بلند آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ گھر پڑی میت کے پاس اہل و عیال کی رو رو کر جو آواز بیٹھ چکی تھی تو اب جب وہ کسی کی آمد پر پھٹ پڑتے تو رونے کی یہ دلخراش آوازیں اور بھی درد ناک ہو جاتیں۔ کہیں موذن نے فجر کی اذان شروع کی، سبھی مرد حضرات عورتوں کو چپ ہونے کی تلقین کرنے لگے اور وہ جیسے اپنے آنچل کو منہ میں دباتے ہوئے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ موذن نے اذان ختم کی اور پھر ساتھ ہی مسجد سے اجمل کی نماز جنازہ کا اعلان ہونے لگا پھر میں نے دیکھا چند لوگ غسل کے لیے اجمل کی چارپائی کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے اجمل کے اماں، ابا اور بہنوں کو سنبھالا اور وہ جیسے اپنے بازو آگے پھیلائے اپنے بھائی کو روکنا چاہتی تھیں۔

مائیکل پھر سے جو میرے پاس آیا تو جیسے مجھے اسی کا انتظار تھا۔ اس کے میرے قریب بیٹھتے ہی میں نے اس سے دریافت کیا کہ پولیس کو قاتل کا کوئی سراغ ملا یا کسی ٹی وی چینل پر کوئی خبر چل رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایسی صورت حال میں ٹی وی، آن کرنے کا کسے ہوش ہے اور جہاں تک پولیس کو سراغ ملنے کی بات ہے تو ابھی تک مقدمہ ہی درج نہیں ہوا لیکن ہاں پولیس پہنچ چکی ہے۔ وہ دکان کا بھی جائزہ لے کر اب اجمل کے گھر سے باہر ہی موجود ہیں۔ پولیس پوسٹ مارٹم کرنے کا کہہ رہی ہے لیکن جہاں تک میں اجمل کے ابا کو جانتا ہوں وہ پوسٹ مارٹم کے لیے نہیں مانیں گے۔" مائیکل کچھ وقت کے لیے میرے پاس بیٹھا رہا اور پھر جب اجمل کی میت کو غسل دے کر اسے واپس گھر لایا گیا تو مائیکل میرے پاس سے اٹھ کر پھر چلا گیا۔

نئے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا اس دن کے طلوع ہوتے ہی چار سو یہ خبر پھیل چکی ہوگی کہ اجمل کا قاتل مل گیا ہے۔ شہر کے مشہور سیاسی کارکن خورشید عالم کا بیٹا طہٰ عالم ہی اجمل کا قاتل

ہے۔ نیوز چینل والے اس خبر کو بریکنگ نیوز بنا کر پیش کر رہے ہوں گے۔ ایک کہرام میرے گھر بھی بپا ہو چکا ہوگا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ابھی تک تو تھانے میں اجمل کے قتل کا کیس بھی درج نہ ہوا تھا اور جو پولیس تفتیش کرنے پہنچی تھی جیسے انہیں بھی کوئی اجمل جیسے ایک چھوٹے سے عام سے دکان دار کے قتل میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور جب پولیس کا رویہ اتنا سرد تھا تو اخباری نمائندے اور میڈیا والے تو ایسے عام لوگوں کے قتل کی خبر کسی اندرونی صفحے کے آخری کونے میں چند سطروں میں شائع کیا کرتے ہیں۔

لیکن اگر مقدمہ درج ہو بھی چکا ہوتا' پولیس کی تفتیشی ٹیم کے ہاتھ میرا گرا ہوا ریوالور لگ بھی چکا ہوتا اور پھر پولیس جان جاتی کہ اجمل کا قاتل کون ہے؟ یوں اگر میڈیا پر بریکنگ نیوز کے طور پر یہ خبر بھی چل رہی ہوتی کہ مشہور سیاسی کارکن خورشید عالم کا بیٹا ہی اجمل کا قاتل ہے اور پھر میں گرفتار بھی ہو چکا ہوتا تو کیا اجمل کو انصاف مل جاتا' میرا ذہن اس اٹھتے سوال کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔ میری آنکھوں دیکھے ایسے سیکڑوں واقعات تھے۔ ہمارے اردگرد ہم جیسے سیاسی رہنماؤں کی بگڑی اولادوں سے کئی قتل ہو جاتے اور پہلے پہل یونہی بریکنگ نیوز کے طور پر خبریں چلتیں میڈیا پر ٹاک شوز چلائے جاتے اور کچھ وقت کے گزرتے ہی بات ماضی کا قصہ ہی ثابت ہوتیں' کبھی دیت کے نام پر تو کبھی اثر ورسوخ سے ہم جیسوں کے بڑے بڑے گناہوں پہ پردے ڈال دیئے جاتے۔

لیکن اب ایسا نہیں ہوگا' اب کوئی اجمل کے قاتل کو پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا پائے گا' اب خورشید عالم کا اثر ورسوخ اجمل کے ماں باپ، بہنوں کو ہراساں کر کے مجھے معافی نہیں دلا سکتا' میں ایسا اپنے آپ سے عہد لے رہا تھا۔

میں نے اجمل کے گھر کے آنگن کی طرف دیکھا' اب دن خاصا نکل آیا تھا۔ اجمل کی میت کے گرد بہت سے لوگ ہاتھوں میں سپارے اٹھائے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ غسل کے بعد اجمل کو سفید کفن دے کر گلاب کے ہار پہنا کر لایا گیا تھا لیکن چہرہ دیکھنے والوں کی اس قدر بھیڑ تھی کہ یہاں اوپر چھت سے بھی اجمل کا چہرہ میں واضح نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ پھر ایک جھلک مجھے مل ہی گئی کس قدر نور تھا اس کے چہرے پر سیاہ داڑھی میں دمکتا سپید چہرہ گلابوں کے ہار پہن کر وہ کیسی پرسکون نیند سو رہا تھا۔ اجمل کے پرنور چہرے کو دیکھ کر نہ جانے کیسے میرے دل میں ایک خواہش جاگی کہ مجھے اجمل کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے جانا چاہیے۔ کیسی غیر معقول سی خواہش نے میرے دل میں جنم لیا تھا۔ میں جو اس کا قاتل تھا۔ تو اب اس کی مغفرت کے لیے اس کی نماز جنازہ میں بھی شرکت کا خواہش مند تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے لیے ایسا کرنا' سوچنے جتنا آسان نہیں تھا۔ میں جو کب سے ایک ہی جگہ بے حس وحرکت پڑا تھا' جیسے میں اپنی جگہ سے ذرا سا بھی ہلا جلا تو مجھے کوئی دیکھ لے گا' کوئی مجھے پہچان جائے گا' کہ یہی اجمل کا قاتل ہے اور یہ اس وقت اجمل کے گھر سے ملحقہ چھت پر چھپا دبکا بیٹھا ہے۔ ایسے میں میرا اجمل کے جنازے کے ساتھ چلنا آسان نہ تھا' پھر اپنے دل اور ارادے کو میں نے یوں مضبوط کرنے کی کوشش کی کہ میں اجمل کی نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد وہیں سے سیدھا تھانے جا کر اقبال جرم کر لوں گا۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ پھر قانون چاہے تو مجھے پھانسی لگا دے اور میری خواہش یہ ہوتی کہ عمر قید میں ہر ہر لمحہ احساس جرم کی اذیت سہنے کی بجائے

قانون مجھے اجمل کے قتل کے جرم میں سزائے موت ہی سنائے۔

جنازہ اٹھانے کا وقت ہو رہا تھا' لیکن مائیکل نہ جانے کہاں تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں یہاں سے کیسے جا سکتا تھا۔ میں نے ذرا سر کو گھما کر اجمل کے گھر کے آنگن کا جائزہ لیا' سبھی تلاوت کے بعد ہاتھ اٹھائے میت کے لیے دعا کر رہے تھے۔ جیسے ہی سبھی نے دعا کے بعد ہاتھ چہرے کی طرف پھیرے رونے اور چیخنے کی آوازیں شدید ہوگئیں۔ پھر اجمل کے ابا سب کو چپ کرانے لگے' رات بھر رونے سے ان کا گلا بیٹھ چکا تھا۔

"چپ ہو جاؤ سب...... خاموش ہو جاؤ...... یہ کوئی رونے کا وقت ہے۔ میرے اجمل کی بارات باہر تیار کھڑی ہے۔ اسے دولہے کی طرح سجاؤ اس کی آج بارات نکلے گی' اس آنگن سے۔ میرے پتر کے کوئی ارمان آج ادھورے نہ رہیں۔"

"اجمل...... نہیں اجمل۔" اجمل کے ابا کی بات سن کر وہاں سبھی لوگ یوں تڑپ کر رونے لگے' یہ دیکھ کر وہ پھر سب کو چپ کراتے لگے۔ "میں نے کہا ناں کہ کوئی نہ روئے پھر کیوں روتے ہو' سب جاؤ پتر اجمل کا سہرا لاؤ' وہ روتی ہوئی اپنی بیٹیوں سے کہہ رہے تھے۔ اجمل کی شادی کی ساری تیاریاں مکمل تھیں فقط دس بارہ دن بعد ہی اس آنگن سے اس کی یوں دھوم دھام سے بارات نکلنا تھی۔ پھر یہ دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا' جب اجمل کی ایک بہن نے اندر سے سہرا لا کر اجمل کے سینے پر رکھ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر اجمل کے ابا خود ہی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ اب جنازہ اٹھانے کی تیاری ہو رہی تھی اور مائیکل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آ جائے تو میں اسے کہوں کہ مجھے بھی اجمل کی نماز جنازہ میں شرکت کرنی ہے پھر جیسے یہ سوچ کر مجھے مایوسی ہونے لگی کہ اگر مائیکل بھی جنازے کے ساتھ چلا گیا تو میری یہ خواہش ادھوری ہی رہ جائے گی' ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب مائیکل تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا میری جانب بڑھا۔ "صاحب جنازہ بالکل تیار ہے' میں بس یہی کہنے آیا تھا۔"

مائیکل کی بات ختم ہوتے ہی میں جھٹ سے بولا۔

"مائیکل مجھے اجمل کے جنازہ میں شرکت کرنا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے۔" پہلے تو وہ میری بات سن کر چونکا اور پھر کچھ سوچنے لگا اور بولا۔

"صاحب آپ کو یہاں کوئی نہیں پہچانتا اور ابھی تک کسی کو کچھ علم نہیں کہ اجمل کا قاتل کون ہے' پھر......؟" مائیکل کی بات کو بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے جیسے میں نے مکمل کیا۔

"ہاں مائیکل پھر یہ ممکن ہے' کیسے بھی ہو مجھے اجمل کے نماز جنازہ میں ضرور شامل ہونا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے' صاحب میں ابھی آتا ہوں۔" مائیکل یہ کہہ کر پھر سے واپس چلا گیا اور جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں وہ رومال تھا جو اکثر حجاج کرام واپسی پر اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ "صاحب یہ رومال آپ سر پر اوڑھ لیں اور جب جنازہ گھر سے اٹھایا جائے اور گلی سے کچھ آگے نکل جائے آپ میرے گھر کے دروازے سے نکل کر پیچھے پیچھے چلے آنا۔" اس نے میرے قریب آتے ہی رومال میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے جھٹ سے رومال مائیکل کے ہاتھ سے لیا اور اسے سر پر یوں اوڑھا کہ اس کے دونوں سروں نے میرے کچھ چہرے کو بھی چھپا لیا تھا۔

اب جو جواں سالہ اجمل کا جنازہ ساتھ والے گھر کے آنگن سے اٹھا تو جیسے ایک قیامت بپا ہوگئی۔ مائیکل مجھے چھوڑ کر نیچے کی جانب دوڑا وہ آخری

رسومات میں اہل خانہ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ وہ اجمل کا قریبی ہمسایہ تھا۔ جنازہ اب گلی میں سے گزر رہا تھا میں نے منوں بھاری ہوتے وجود کے ساتھ مائیکل کے گھر نیچے آنگن میں اترتی سیڑھی پر قدم رکھا۔ نیچے آنگن سنسان ویران پڑا تھا اور پھر میں جلدی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے اسی دروازے تک پہنچ گیا جہاں سے مجھے گلی میں اترنا تھا اور اجمل کے جنازہ میں شرکت کے لیے جانا تھا۔

وہ لوگ اجمل کا جنازہ اٹھائے اب گلی میں سے گزرتے ہوئے آگے نکل چکے تھے اور میں جو مائیکل کے گھر کے دروازے کے اس جانب کھڑا تھا یہ ہمت ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ میں دروازہ کھولوں اور گلی میں قدم رکھ دوں۔ آوازوں سے اب یونہی محسوس ہو رہا تھا کہ گلی میں فقط باقی رہ جانے والی عورتیں ہی کھڑی تھیں جو کہ اجمل کے اہل وعیال کو سنبھالتی انہیں واپس گھر لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب مجھے ذرا دیر نہیں کرنی چاہیے میں نے جیسے اپنے ارادے کو مضبوط کرنے کے لیے سوچا اور دروازہ کھول کر میں سر جھکائے گلی میں اتر گیا۔

''یا اللہ تباہ و برباد کردے اسے یا اللہ میرے اجمل کو مارنے والے کو گھڑی گھڑی موت دے اس کا بھی سکون چھین لے۔'' گلی میں اب بہت سی عورتوں کے درمیان اجمل کے گھر کی خواتین کھڑی مجھے ہی بددعائیں دے رہی تھیں جب میں ان کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہ بے خبر تھیں کہ وہ جس کے لیے بددعائیں کر رہی تھیں وہ اس وقت انہی کے بیچ میں سے گزر کر جا رہا ہے۔ میں تیز تیز قدم بڑھا کر وہاں سے آگے نکل گیا۔

گلی میں سے نکلتے ہی میں نے سر اٹھا کر دیکھا جنازہ اب کافی آگے نکل چکا تھا۔ مائیکل کے گھر کھڑے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ باہر لوگوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہوگی لیکن جنازہ میں میری سوچ کے برعکس کوئی بہت زیادہ لوگ نہ تھے۔ جنازہ گاہ پہنچ کر میت کو سامنے رکھ دیا گیا اور لوگ قطار در قطار صفیں بنانے لگے۔ میں بھی ایک جگہ صف میں کھڑا ہو گیا۔ جب تمام صفیں مکمل ہو گئیں تو جنازہ پڑھانے کے لیے وہاں موجود قاری صاحب لوگوں سے مخاطب تھے۔

''السلام علیکم بھائیو سب نے باری باری یہاں سے چلے جانا ہے آج ہم کسی کی نماز جنازہ میں کھڑے ہیں تو کل ہماری نماز جنازہ پڑھائی جا رہی ہوگی۔ بات تو فقط سمجھنے کی ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ آج ہم یہاں جو بوئیں گے کل وہی وہاں کاٹیں گے جو یہاں کسی کی حق تلفی کرے گا کل اسے وہاں جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جو اس دنیا سے چلا گیا اس کے ذمے اگر کسی کے واجبات ہوں تو اسے معاف کردیں پھر بھی یہاں میت کے اہل وعیال موجود ہیں کسی نے جانے والے سے کچھ لینا ہو تو وہ جنازہ کے بعد میت کے اہل وعیال سے مل سکتا ہے......'' قاری صاحب ابھی اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے اور میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اجمل کے ذمے لوگوں کا کوئی قرض ہو یا نہ ہو لیکن میرے ذمے اجمل کا جو قرض تھا وہ تو میں اپنی جان دے کر بھی نہ چکا سکتا تھا۔ میں اجمل کے ابا کو ان کا بیٹا نہیں لوٹا سکتا تھا۔ میں اس کی چار بہنوں کو ان کا لاڈلا بھائی کہاں سے لاکر دیتا۔ اس کی ماں جس پر ابھی تک غشی کے دورے طاری ہوں گے اسے اس کا لال کہاں سے لوٹاتا۔ وہیں جنازہ گاہ میں میں منوں مٹی تلے جیسے درگور ہو رہا تھا۔ جنازہ اجمل کا نہیں گویا میرا پڑھایا جا رہا تھا پھر جنازہ مکمل ہوا لوگ اجمل کے آخری دیدار کے لیے آگے بڑھے لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اجمل کی

میت تک پہنچتا میں کچھ دیر اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا اور پھر جنازہ گاہ سے باہر آ گیا۔

جنازہ گاہ قصبے کی سڑک کے ساتھ ہی واقع تھی۔ باہر نکلتے ہی مجھے جنازہ گاہ کے دروازے کے سامنے کئی رکشے کھڑے دکھائی دیئے۔ میں آگے بڑھ کر ایک رکشے میں بیٹھتے ہوئے اسے تھانے چلنے کو کہا۔ رکشے میں موجود نوجوان لڑکے نے مجھے ایک بار مڑ کر چونک کر دیکھا اور پھر رکشہ آگے بڑھا دیا۔

''سنا ہے بھائی قتل ہونے والے اس آدمی کے قاتل کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔'' میں جو سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ تھانے جا کر اقبال جرم کے بعد میرے اپنے خاندان پر کیا گزرے گی اب رکشہ ڈرائیور کی بات سن کر ایک دم سے چونک پڑا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا پھر وہ خود ہی بولتا رہا۔

''بھائی وہ بچ نہیں سکتا' قتل کوئی معمولی شے تو نہیں ہوتی۔ سنا ہے' قتل ہونے والے کی تو کوئی دشمنی بھی نہ تھی۔ بے چارہ بے گناہ ہی مارا گیا لیکن بھائی کچھ کہہ نہیں سکتے یہ پاکستان ہے' یہاں ایک ہی دن میں نہ جانے کتنے ہی لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ پر انصاف کس کو ملتا ہے' یہاں۔'' وہ یونہی بولتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا' تھانہ زیادہ دور نہ تھا کچھ ہی دیر بعد اس لڑکے نے تھانے کے گیٹ کے سامنے رکشہ روک دیا۔

''بھائی آپ مرنے والے کے کوئی رشتہ دار ہیں' مجھے بڑا افسوس ہے' سنا ہے' ابھی شادی میں چند دن ہی باقی تھے۔'' رکشے میں سے اترتے ہوئے اس کی بات پر میرا دل چاہا میں اسے کہوں میں ہی وہ بے رحم قاتل ہوں جس نے اجمل کو قتل ہی نہیں کیا اس کا گھر ہی اجاڑ دیا۔ میرے کسی بھی بات کا جواب نہ دینے پر وہ مجھ سے پیسے لیتے ہوئے مجھے حیرت زدہ سا کھڑا دیکھتا رہا اور میں تھانے کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ یہ تھانے اور کورٹ کچہری میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ابا شہر کے ایم این اے تھے۔ بعض اوقات ابا کے اپنے یا لوگوں کے کئی طرح کے مسائل کی خاطر میرا بھی ابا کے ساتھ تھانے کچہری کا چکر لگتا رہتا تھا۔

میں سیدھا ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اس وقت اپنے ماتحت عملے کو کوئی ہدایات دے رہے تھے۔ میرے سلام کرنے اور ان کے میز کے پاس کھڑے ہونے کے باوجود انہوں نے میری آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا پھر کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان کے میری جانب متوجہ ہوتے ہی میں نے خود سے سرزد ہوئے قتل کا اقبال جرم کر ڈالا۔ میرے ایسا کرتے ہی جیسے کمرے میں ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ رات نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر اسی تھانے میں درج کی گئی تھی اور پولیس نے تحقیقات کے بعد جس مجرم تک پہنچنا تھا وہ چوبیس گھنٹوں سے بھی پہلے خود چل کر ان تک پہنچ گیا تھا۔

میرے اقبال جرم کرنے تک وہاں موجود کوئی شخص مجھے نہیں پہچانتا تھا' کہ میں کون ہوں لیکن جب میرا بیان ریکارڈ کیا جا رہا تھا اور میں نے اپنے ابا کا نام بتایا تو پھر یہ راز نہ رہا۔ سوالات کا سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا اور پھر مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ میرے پاس موجود بھی سامان پولیس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ ایس ایچ او نے آخری بار مجھے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی تو میں نے انکار کر دیا۔ شاید اس لیے کہ مجھ میں خود ہی اپنے ابا یا گھر کے کسی فرد کو اپنے جرم کے بارے میں بتانے کی ہمت نہ تھی۔ مجھے حوالات کے پیچھے ابھی چند لمحے ہی بیتے تھے۔

حوالات کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے قتل کا اقبال جرم کر لینے والے مجرم کی دماغی حالت بالکل ایسی ہوتی ہے، جیسے اپنے ہی ہاتھوں خنجر لیے کوئی خود اپنا گلا کاٹنا چاہتا ہو، ہاتھ گلے تک پہنچتا ہو، خنجر کا لمس گلے کی رگوں سے مس ہو رہا ہو لیکن ہاتھ نہ چلے، میں سلاخوں کے پیچھے ایک کونے میں بیٹھا آنے والے لمحوں کی اذیت کو ابھی سے محسوس کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب تک میرے اہل خانہ تک یہ خبر پہنچ چکی ہوگی بلکہ ٹی وی چینل پر بریکنگ نیوز یا کریڈ سے اجمل کے ابا اور گھر والے بھی اس بات سے آگاہ ہو چکے ہوں گے کہ ان کے بے گناہ بیٹے کی موت کے مجرم نے خود چل کر خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

مجھے حوالات میں بند ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب ابا' بھائی اور مائیکل میرے پاس آ پہنچے تھے۔ انہیں پولیس اسٹیشن سے ہی خبر پہنچ گئی تھی۔ ابا اور بھائی کو دیکھ کر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میرے رخسار آنسوؤں سے بھیگنے لگے۔ میں ان کے سامنے سر نہیں اٹھا پا رہا تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ میں بھائی اور ابا کے چہروں کی جانب دیکھتا۔ وہ بار بار ایک ہی شکوہ کیے جا رہے تھے کہ میں نے ان سے رابطہ کیوں نہ کیا اور اگر مجھ سے قتل جیسا جرم سرزد ہو ہی گیا تھا تو میں کہیں بھاگ کر چھپ کیوں نہیں گیا۔ اب میں ابا یا بھائی کو کیا بتاتا کہ میں بھاگ کر پناہ ڈھونڈنے تو نکلا تھا لیکن پھر ان جانے میں میں اسی گھر جا پہنچا تھا جس گھر کے گلشن کو میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اجاڑا تھا۔

پھر ایک اور بری خبر مجھے مائیکل سے پتہ چلی' اس نے مجھے بتایا کہ اجمل کے ابا کی آخری خواہش بھی پوری نہ ہو سکی وہ جو چاہتے تھے کہ ان کے لخت جگر کا پوسٹ مارٹم نہ ہو لیکن نماز جنازہ کے فوراً بعد ہی پولیس وہاں پہنچی اور اجمل کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئی۔ مائیکل کی زبانی یہ سب سن کر مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ ابھی میں اسی صدمے سے دوچار کھڑا تھا کہ بڑے ابا' ماں اور بھابی کو لے کر پہنچ گئے۔ ماں روتی ہوئی میرے پاس پہنچی تھی۔ مجھے یوں سلاخوں سے پرے بند دیکھ کر اپنے ہوش و حواس پر قابو نہ رکھ پائی تھی۔ کچھ دیر بعد بھائی اور بھابی ماں کو لے کر باہر چلے گئے اور اب فقط ابا' بڑے ابا اور مائیکل ہی میرے پاس موجود تھے۔ میں مسلسل سر جھکائے اپنا سر سلاخوں سے ٹکائے روئے جا رہا تھا۔ بڑے ابا نے ایک ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور کچھ خاموشی کے بعد بولے۔

''میاں یہ سب تو ہونا ہی تھا میں تو تم لوگوں کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا' کوئی میری سنتا کب تھا۔ میں کہتا رہ گیا کہ فقط حلال کماؤ اور حلال کھاؤ اور تم لوگ اپنی ہی من مرضیاں کرتے چلے گئے۔ شریعت کی پابندیوں سے روگردانی کرنے کے ایسے ہی نتائج نکلا کرتے ہیں لیکن مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی بیٹا کہ تم نے اقبال جرم کر لیا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں طٰہٰ بیٹا تم کوئی کسی قسم کی فکر مت کرنا۔ اللہ بہتر کرے گا' اور عدالت بھی ایسے مجرموں کے ساتھ رعایت کیا کرتی ہے جو اپنے جرم کا خود اقرار کر لیتے ہیں۔'' میرے ابا تو اب بھی مجھے فقط بھاگ جانے کہیں چھپ جانے' اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے اور کسی طرح سے باہر ہی باہر معاملے کو نپٹا لینے کا درس دے رہے تھے لیکن بڑے ابا کی باتیں سن کر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم واقعی غلطی پر تھے۔ ہم جو حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر زندگی گزار رہے تھے تو ایک روز تو اس نے اپنا اثر دکھانا ہی تھا۔

اگلے چند گھنٹوں میں ابا نے میری ضمانت کے لیے ہر ممکن کوشش کر لی' لیکن میری ضمانت منظور نہ ہو سکی۔ مائیکل سے مجھے پتہ چلا کہ پولیس اسٹیشن سے

باہر اخبار اور ٹی وی چینل کے نمائندوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور یہ بھی ابا کی کوششوں سے ہوا تھا کہ وہ اب تک مجھ تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ ابا نہیں چاہتے تھے کہ اخباروں یا نیوز چینل کے ذریعے لوگ میرا بیان سن پائیں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے سیاسی کریئر کو بچانے کے لیے سرگرداں تھے۔

میں ایک بار پھر سے تنہا ہو گیا تھا سبھی مجھے حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے واپس چلے گئے تھے اور میں اب سلاخوں کے پیچھے بیٹھا دعائیں کرنے لگا تھا کہ یارب اجمل کے ابا یا اس کے گھر کے کسی فرد سے میرا سامنا نہ ہو۔ اگر وہ میرے سامنے آجائیں تو میرے پاس ان کے کسی سوال کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ میں فقط ان کے بیٹے کا ہی نہیں ان سبھی کا مجرم تھا جن سے میں نے ایک بیٹا' ایک بھائی چھین لیا تھا۔ میں جیل کے ننگے فرش پر لیٹا یہی سوچ رہا تھا' میرے اوپر روشن دان سے آنے والی روشنی کی بیم اب غائب ہو چکی تھی' آج کے دن کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ میرے مقدر میرے عروج کا ستارہ ڈوب رہا تھا۔

رات اور پھر دن بھر جاگتے رہنے سے میرے دماغ کی رگوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جیل کے ننگے فرش پر ہاتھ کا سرہانہ بنا کر لیٹنے سے جیسے مجھے کچھ بہتر محسوس ہو رہا تھا اور پھر نہ جانے کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ کمرہ عدالت میں' میں کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اجمل کے وکیل نے تمام ثبوت جج صاحب کے سامنے رکھ دیئے اور پھر وہ بھری عدالت میں مجھ سے میرے جرم کا اقرار لینے لگا۔

میں نے ذرا نگاہ اٹھا کر دیکھا میری ماں کمرہ عدالت میں ہاتھوں سے آنچل اٹھائے گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی۔ ابا اور بھائی کے دل کی حرکت جیسے بے ترتیب ہوئے جا رہی تھی اور بڑے ابا کے ہاتھ میں موجود تسبیح میں چلنے والے موتی اب تیز تیز گرنے لگے تھے۔ میرا بیان وہی تھا' میں نے اپنے جرم کے اقرار کو جج صاحب کے سامنے دہرایا تو میرا ایسا کرنا میرے خاندان پر قیامت بن کر ٹوٹا۔ جج صاحب نے مجھے سزائے موت سنا کر قلم توڑ دیا۔ اب مجھے پھانسی پر چڑھانے کے لیے تختہ دار تک لے جایا جا رہا تھا پھر مجھے تختہ دار پر کھڑا کر کے میرے چہرے کو سیاہ کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا اور میرے چار سو جیسے مہیب سا سناٹا گہرا اندھیرا چھا گیا۔ پھانسی کے پھندے کو میرے گلے میں ڈالا گیا تو پھانسی کے پھندے کی رسی کے لمس نے میرے وجود سے جیسے ابھی سے روح کھینچ لی تھی۔ میرے پیروں تلے سے ابھی تختہ نہیں سرکا تھا جب مجھے شور سنائی دینے لگا۔ اس شور میں مجھے ماں کے رونے کی آواز بھی سنائی دی اور ساتھ ہی کسی کے شکر ادا کرنے کی آواز بھی سنائی دی تو مجھے تعجب ہوا۔ میں یہی سمجھا شاید یہ آواز اجمل کے خاندان کے کسی فرد کی ہوگی لیکن پھر ایک ساتھ مجھے کئی آوازیں آنے لگیں۔ اگلے ہی پل میری آنکھ کھل گئی۔ اب سلاخوں سے باہر اپنے خاندان بھر کو کھڑا دیکھ کر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ماں' ابا' بھائی' بڑے ابا' مائیکل' ابا کے چند قریبی دوست احباب اور ہمارے رشتہ دار ایک بڑی تعداد سلاخوں سے باہر موجود تھی۔ وہ سبھی بے حد خوش تھے اور شکرانے کے الفاظ بار بار ان کے لبوں پر جاری تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ایک خواب سے کسی دوسرے خواب میں جا اترا ہوں' ابھی چند ثانیے پہلے میں کسی خواب میں تختہ دار پر کھڑا اپنے پیروں تلے سے تختہ سرکنے کا انتظار کر رہا تھا اور اب اگلے ہی پل میرے اہل وعیال خوش دکھائی دے رہے تھے' پھر بڑے ابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ طٰہٰ بیٹا

اجمل کے اہل خانہ نے تمہیں اپنے بیٹے کا خون معاف کردیا ہے۔ اجمل کے ابا نے خود تھانے آ کر بیان دیا ہے کہ وہ اور اس کے اہل خانہ تمہیں اپنے بیٹے کا خون معاف کرتے ہیں۔ بیٹا اللہ نے تمہیں نئی زندگی بخش دی۔ بڑے ابا کی بات سن کر خوشی تو دور کی بات میرے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا' چند گھنٹوں میں ہی اجمل کے ابا نے تھانے پہنچ کر بیان دے دیا کہ وہ اپنے اکلوتے جواں سال بیٹے کے قاتل کو معاف کرتے ہیں' ایسا کیسے ممکن تھا' مجھے اپنے ابا پر شک ہونے لگا۔ میری نگاہوں کے سامنے ابا کا سارا اثر و رسوخ گھومنے لگا۔ دولت 'روپیہ' پیسہ' دھمکیاں' اسلحہ' دہشت' اجمل کے اہل خانہ میرے ذہن میں گھومنے لگے۔ اجمل کے کمزور بوڑھے والدین' جواں سالہ بہنیں ان کی عزت و آبرو' مجھے اپنے ابا سے شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ ابا نے ضرور اجمل کے اہل و عیال پر یہ بات واضح کردی ہوگی کہ ان کے میرے خلاف بیان دینے پر ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوسکتا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ فقط آج کی رات مجھے حوالات میں گزارنا پڑے گی۔ اس کے بعد نئے دن کے سورج کے طلوع ہوتے ہی میں بری ہوجاؤں گا۔ میں جس نے ایک بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا' میں ہمیشہ کے لیے اس کیس سے بری ہوجاؤں گا' کیونکہ اجمل کے اہل خانہ نے مجھے معاف کردیا تھا۔ ایسا مان لینا میرے لیے ناممکن تھا اور حقیقت کیا تھی اب یہ جاننے کے لیے میں بے تابی سے سلاخوں کے پیچھے تڑپ رہا تھا۔ مائیکل اجمل کا ہمسایہ تھا' مجھے اس سے معلوم پڑ سکتا تھا کہ حقیقت کیا تھی لیکن سبھی کے ساتھ ساتھ اب وہ بھی میرے پاس سے جاچکا تھا۔

یہ ایک رات اور اس کا ایک ایک لمحہ میرے لیے پھانسی پر جھول جانے سے بھی زیادہ اذیت ناک تھا۔ میں طٰہٰ عالم جس نے خود پولیس اسٹیشن پہنچ کر اقبال جرم کرلیا تھا اور اب میں چاہتا تھا کہ قانون مجھے میرے جرم کی کڑی سے کڑی سزا دے' اقبال جرم کرنے کے فقط چند گھنٹوں میں ہی رہا ہونے جارہا تھا۔

میں جو کسی ایک کونے میں بیٹھتا تو بے تاب ہوکر اٹھ بیٹھتا اور اس چند گز کے قید خانے میں ادھر سے ادھر چکر کاٹنے لگتا اور پھر یونہی چکر کاٹتے کاٹتے ایک دم سے بیٹھ جاتا' ایسے ہی بے تابی سے تڑپتے ہوئے اٹھتے بیٹھتے میں نے رات گزار دی۔

نئی صبح کا سورج طلوع ہوا تو صبح سویرے ہی بھائی اور مائیکل میرے لیے ناشتہ لے کر آ پہنچے......اور میری تو جیسے بھوک پیاس ہی مٹ چکی تھی۔ بھائی مجھے ناشتہ کرنے کو کہتا رہا اور میں ناشتہ کرنے کی بجائے ایک ہی بات اس سے پوچھتا رہا کہ اجمل کے اہل خانہ نے مجھے معاف کیوں کردیا۔ بھائی جواب میں وہی باتیں کرتا رہا جو میں پہلے بھی سن چکا تھا' اور جن پر یقین کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ بھائی اور مائیکل کے آنے کے چند ایک گھنٹے بعد ہی ابا بھی آ پہنچے تھے۔ اجمل کے ابا کے بیان کے بعد آج مجھے ضمانت پر رہا کردیا گیا تھا لیکن اس کیس کو مکمل ہونے اور قانونی اور کاغذی کارروائی میں ابھی چند دن مزید درکار تھے پھر پولیس اسٹیشن سے باہر قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ سیاسی لیڈر یا مشہور ہونا بھی کس قدر عذاب دہ ہوتا ہے۔ یہی جرم میری جگہ کسی عام سے شخص نے کیا ہوتا تو فقط اخبار کے کسی اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر لگتی جسے لوگ پڑھنا بھی گوارہ نہ کرتے لیکن میرا معاملہ اور تھا۔ میں ایک سیاسی لیڈر کی اولاد تھا اور اب میڈیا کے ہاتھ جو میرے قتل کی خبر لگی تو وہ اسے لوگوں کے سامنے جیسے کوئی دلچسپ کھیل بنا کر پیش کررہے تھے۔ لمحہ لمحہ

بھر کی خبریں منظر عام پر لائی جارہی تھیں اور پھر چوبیس گھنٹوں میں ہی مجھے معافی کے مل جانے اور چھوٹ جانے نے میڈیا میں ہلچل ہی مچادی تھی اور ہر طرف انصاف انصاف کی آوازیں گردش کررہی تھیں۔

بڑی مشکل سے ابا میڈیا والوں کے سوالوں سے بچا کر مجھے گھر لے کر پہنچے تھے اور گھر پہنچتے ہی انہوں نے جو کچہری بٹھالی تو اب ان کی عدالت میں میں مجرم بنا بیٹھا تھا۔ انہیں اپنا سیاسی مستقبل صاف ڈوبتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی پیچ وتاب میں وہ بولتے چلے جارہے تھے اور میں سر جھکائے فقط سننے کے سوا کیا جواب دے سکتا تھا۔ الیکشن قریب تھے۔ ابا اب کی بار بھی شکست ماننے والے نہ تھے لیکن مجھ سے سرزد ہوجانے والے جرم اور اس کی میڈیا کو خبر ہوجانے کے بعد اب ابا کو اپنی ہار واضح دکھائی دے رہی تھی۔

بڑے ابا' بھائی' ماں بھی جیسے مومی مجسمے بنے بیٹھے تھے اور ابا تھے کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ بڑے ابا کوئی بات کہنے لگتے تو جیسے وہ پھر سے ایک دم سے بھڑک اٹھتے۔ ''اتنی بڑی غلطی اس سے کیسے سرزد ہوسکتی ہے' پچھلے کئی سالوں سے میرے ساتھ رہتے ہوئے اس نے مجھ سے یہی سب سیکھا ہے' ہم لوگوں کی چھینکیں تک لوگ گنتے ہیں اور یہ برخوردار قتل جیسا جرم کرنے کے بعد اقبال جرم کرنے پولیس اسٹیشن جاپہنچے۔ جیسے ان کے پھانسی چڑھ جانے سے لواحقین کو انصاف مل جائے گا۔ ہوجاتی ہیں' غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں' لیکن ہر کام کا کوئی ڈھنگ ہوتا ہے۔ چار بہنوں کا بھائی' بوڑھے ماں باپ انہیں تمہاری پھانسی نہیں چاہیے میاں انہیں سہارا چاہیے اور وہ روپوں سے ملتا ہے' اور تم چلے سیدھے پھانسی چڑھنے' پھر تم نے ایک بار بھی کسی کو آگاہ کرنا تک مناسب نہ سمجھا۔'' ابا رکنے کا نام ہی نہ لے رہے

سمجھوتہ

ایک نوآموز شاعر نے ایڈیٹر سے شکوہ کیا۔

''آپ لوگوں نے شاعروں اور ادیبوں پر یہ پابندی لگا رکھی ہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔''

''یہ تو ہم نے حالات سے سمجھوتہ کیا ہوا ہے۔'' ایڈیٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔

''حالات سے سمجھوتہ' کیا مطلب؟'' نوآموز شاعر نے حیرت سے دریافت کیا۔

''بعض لوگوں کے بارے میں تو ہمارا یہ پابندی لگانے کو جی چاہتا ہے کہ وہ کاغذ کے کسی طرف بھی نہ لکھیں۔''

حمیرا نوشین...... منڈی بہاؤ الدین

تھے اور مجھے ابا کی باتوں سے کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا کہ ابا نے اجمل کے لواحقین سے مل کر باہر ہی باہر کچھ طے کرلیا ہوگا یا انہیں دبا لیا ہوگا۔ ابا کی لگائی کچہری میں بیٹھے ہوئے میری حالت کو دیکھ کر بڑے ابا جو اتنی دیر سے ابا کی باتیں برداشت کیے جارہے تھے ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر جو انہوں نے تپ کر ابا کو چپ ہوجانے کو کہا تو ایک بار جیسے کمرے میں سناٹا چھا گیا وہ مجھے اپنے ہمراہ لیے میرے کمرے تک چھوڑ کر آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے لیکن ان کے جاتے ہی جیسے تنہائی میرے لیے عذاب بن گئی تھی میں نے تو سوچا تھا کہ میرے اقبال جرم کی خبر اجمل کے ابا اور اس کے گھر کے دیگر افراد جب سنیں گے تو انہیں اک راحت تو نصیب ہوگی' اب اپنے لخت جگر کو کھو کر ان کے سینے میں ایک ہی آگ بھڑک رہی ہوگی کہ کیسے بھی ان کے بیٹے کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ جائے لیکن پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ انہوں نے مجھے معاف کردیا' ابا کی باتوں نے میرے وہم کو مزید یقین میں بدل

دیا تھا اور میں اب سوچ رہا تھا کہ آخر ابا نے ایسا کیا کیا ہوگا کہ فقط قتل کے چند گھنٹوں بعد ہی اجمل کے ابا تھانے پہنچ کر مجھے معاف کردینے کا بیان ریکارڈ کرواگئے۔ اسی راز کو جاننے کے لیے میں بے تاب تھا اور گھر آنے کے بعد سب سے پہلے میں اس سلسلے میں مائیکل سے ملا لیکن مائیکل کا حال بھی کچھ میرے جیسا ہی تھا۔ وہ اجمل کا ہمسایہ تھا' اس کے باوجود بھی وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا' پھر جیسے وہ مضطرب ہوکر بولا۔ ''اجمل کے ابا جان گئے ہیں کہ میں آپ کے گھر کا ڈرائیور ہوں۔'' یوں وہ اب مائیکل سے بھی سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔ میں نے مائیکل سے التجا کرتے ہوئے کہا کہ وہ کیسے بھی مجھے اجمل کے ابا سے ملوادے۔ اجمل کے ابا سے مل کر میں ان کے پیر پکڑ لوں گا اور ان سے معافی طلب کروں گا' پھر ان سے معلوم کروں گا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے اپنے بیٹے کا خون معاف کردیا۔ مائیکل نے میری بات سن کر ہامی بھرلی تو میں نے مائیکل کو اسی وقت اس کام کے لیے روانہ کردیا' اور جب تک مائیکل واپس نہ لوٹا میں بے تابی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ مائیکل نے واپس لوٹتے ہی مجھے مشورہ دیا کہ میں اجمل کے ابا سے نہ ملوں' اس نے اجمل کے ابا سے مل کر ان کی شدید نفرت اور غصہ دیکھ لیا تھا اور ان کی ذہنی حالت سے مجھے آگاہ کردیا تھا۔ ایسے میں اگر میں ان کے سامنے جاتا ہوں تو ان کے بیٹے کا غم جو ابھی تازہ ہی تھا اپنے بیٹے کے قاتل کو سامنے کھڑا پاکر انہیں کس قدر اذیت پہنچے گی یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں خود بھی اضطراب میں مبتلا ہورہا تھا۔

لیکن پھر سوچتا کہ اگر میرے سوال کا جواب مجھے کسی سے مل سکتا تھا تو وہ فقط اجمل کے ابا ہی تھے اور جہاں تک ان کے غم کے تازہ ہونے کی بات تھی تو وہ برسوں گزرنے کے بعد بھی میرے ان کے سامنے آجانے پر ویسا ہی ہرا ہوجاتا اور وہ مجھ سے ویسا ہی رویہ اختیار کرتے جیسا وہ میرے آج ان سے ملنے پر ان کا مجھ سے نفرت انگیز رویہ ہوتا۔ یہی سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی سے بھی کچھ کہے بغیر خود اجمل کے ابا سے جا کر ملوں گا۔

اسی مقصد سے اگلے ہی روز میں گاڑی لے کر نکلا اور اجمل کے گھر کی اسی گلی سے باہر جا کھڑا ہوا جس گلی میں اجمل کا گھر تھا' پھر وہاں گلی سے باہر کھڑے گلی سے نکلتے کسی بھی شخص کو دیکھ کر میں یوں چونک جاتا جیسے وہ اجمل کے ہی گھر کا کوئی فرد ہو۔ وہاں کھڑے میرے اردگرد سے گزرتے لوگوں کی نظر جب مجھ پر پڑتی تو میں جیسے کانپ اٹھتا اور سوچنے لگتا کہ کہیں یہ لوگ مجھے پہچانتے تو نہیں۔ ابھی میں ایسی ہی کشمکش میں مبتلا تھا جب ظہر کی اذان ہونے لگی اور پھر اگلے ہی پل مجھے اجمل کے ابا گلی میں سے نکلتے دکھائی دیئے۔ ان پر پہلی نظر پڑتے ہی میں سرتاپا کانپ اٹھا۔

میں جو ارادہ کرکے آیا تھا کہ اجمل کے ابا کے سامنے آتے ہی میں ان کے پیروں میں گر کر ان سے معافی طلب کروں گا۔ اب اپنی جگہ بے حس وحرکت یوں کھڑا تھا جیسے میرے پیروں تلے تارکول کی ابھی تازہ گرم گرم پتلی تہہ بچھی ہو اور میں تارکول سے چپکے پیروں کو چاہ کر بھی اپنی جگہ سے ہٹا نہ پارہا ہوں۔ میں اسی تذبذب میں مبتلا فقط اسی جگہ کھڑا رہا اور وہ میرے سامنے سے گزر کر مسجد تک جا پہنچے' سڑک پار کرکے دوسری جانب ہی وہ مسجد تھی' جس میں وہ نماز ادا کرنے گئے تھے۔ میں جو ان سے ملنے کا سوچ کر آیا تھا تو اب ان سے ملے بغیر واپس کیسے لوٹ جاتا' گاڑی وہیں چھوڑ کر میں بھی سڑک پار کرکے مسجد کے پاس جا پہنچا

اور مسجد کے دروازے سے باہر کھڑا میں اجمل کے ابا کے نماز ادا کر کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد نمازی حضرات نماز ادا کرنے کے بعد ایک ایک کر کے مسجد سے نکلنے لگے تھے میں مسجد سے نکلتے ہر شخص کو بے تابی سے دیکھنے لگتا اور بالآخر مجھے اجمل کے ابا بھی ہاتھوں میں جوتا اٹھائے مسجد سے باہر آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے جوتے کو مسجد سے باہر رکھا اور پھر وہ جوتا پہن کر جیسے ہی آگے بڑھے لامحالہ میں نے آگے بڑھ کر جھک کر ان کے ایک پیر کو پکڑ لیا۔ میرے اچانک ایسا کرنے پر وہ بوکھلا کر میری جانب متوجہ ہوئے۔

''بیٹا کون ہو پاؤں چھوڑو...... چھوڑو بیٹا۔'' انہوں نے فقط ایک بار مجھے دیکھا تھا جب اس قتل والی رات میں نے غلطی سے مائیکل کے گھر کی بجائے انہی کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ شاید رات ہونے یا بینائی کی کمزوری کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہ پائے تھے اور جب وہ پولیس اسٹیشن معافی کا بیان دینے آئے تھے تب بھی انہوں نے مجھے نہ دیکھا تھا لیکن اس سب کے باوجود جانے انہیں میرے وجود سے میری شخصیت سے کیسے یہ معلوم پڑ گیا کہ میں وہی ان کے بیٹے کا بے رحم قاتل ہوں' پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے تھے۔ میں نے بھی ان کے پیر نہ چھوڑے لیکن مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جن سے میں انہیں بتا سکوں کہ میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس نے ان کا گلشن ویران کر دیا ۔ میرے ان کے پیر پکڑنے کے بعد کچھ لوگ ہمارے اردگرد حیرت سے کھڑے مجھے ایسا کرتے دیکھنے لگے تھے لیکن مجھے اس وقت نہ تو ان لوگوں کی پروا تھی اور نہ ہی اتنا ہوش تھا کہ میں ان لوگوں کی طرف دھیان دیتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے لب کھولے۔

''میں وہی آپ کا مجرم ہوں بابا جی۔'' انہوں نے یہ سنتے ہی ایک جھٹکے سے اپنا پاؤں میرے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کروالیا اور اب ان کے چہرے کی جانب دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں جو ان کا مجرم تھا تو مجرموں کی طرح اپنا سر جھکائے ہی رکھا اور پھر اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے ان کے سامنے گڑگڑانے لگا۔

''میں معافی کے قابل نہیں ہوں میں آپ کا آپ کے بیٹے کا مجرم ہوں تو آپ نے مجھے معاف کیوں کیا؟''

''میں نے کب تمہیں معاف کیا' میرے ہاتھ فیصلہ ہوتا تو اسی جگہ لے جا کر تمہارے سینے میں گولیاں برساتا جہاں تم نے میرے اجمل کو مارا تھا۔ تمہیں میں نے نہیں میرے اجمل نے معاف کیا ہے۔''

''اجمل نے معاف...... لیکن اجمل تو......'' میں اجمل کے ابا کی بات سن کر بھونچکا سا ہو کر سوچ رہا تھا' جب وہ تند و تیز لہجے میں پھر سے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''یہی سوچ رہے ہو ناں کہ اجمل تمہیں کیسے معاف کر سکتا ہے' اجمل تو اب اس دنیا میں ہی نہیں۔ کل ظہر کے بعد اسی جگہ چلے آنا جہاں تم نے میرے معصوم بیٹے کی جان لی تھی۔ تمہیں تمہارے اس سوال کا جواب وہیں آ کر مل سکتا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر آبدیدہ سے ہو کر آگے بڑھ گئے اور میں جو فقط اپنے ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے آیا تھا۔ اب بے حس و حرکت کھڑا سیکڑوں سوالوں تلے آ دبا تھا۔ اجمل کے ابا نے مجھے معاف نہیں کیا وہ تو بدلے کی آگ میں ویسے ہی جھلس رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ابھی مجھے گولیوں سے بھون ڈالتے۔ انہوں نے مجھے معاف نہیں کیا تھا بلکہ مجھے اجمل نے معاف کیا تھا یہ کیسے ممکن تھا؟ اجمل

کے جنازہ میں میں نے خود شرکت نہ کی ہوتی تو شاید میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ اجمل میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی لیکن ایسا ممکن نہ تھا' اور اب سوال یہ تھا کہ پھر اجمل مجھے کیسے معاف کرسکتا ہے اور اس سوال کا جواب مجھے تب مل سکتا تھا جب میں اجمل کے ابا کے کہنے کے مطابق اسی جگہ اسی دکان پر ظہر کے بعد پہنچ جاؤں۔ جہاں نشے کی حالت میں مجھ سے گولی چل جانے سے اجمل چل بسا تھا۔

گھر پہنچ کر بھی اجمل کے ابا کے کہے الفاظ میرے دماغ پر ضربیں لگاتے رہے اور میں سوچتا رہا کہ آخر وہاں وہ اسی جگہ مجھے بلا کر ایسا کیا بتانا چاہتے تھے۔ جس سے مجھے یہ معلوم پڑ جائے گا کہ مجھے اجمل کے ابا نے نہیں بلکہ اجمل نے معاف کیا ہے۔ پھر میں سوچنے لگا کہ اجمل کے ابا مجھے وہ بات وہیں کھڑے کھڑے بھی تو بتا سکتے تھے۔ آخر انہوں نے وہ بات بتانے کے لیے اسی جگہ کو کیوں منتخب کیا۔ شاید وہ مجھے اسی جگہ بلا کر اذیت دینا چاہتے تھے۔ احساس دلانا چاہتے تھے کہ میں نے کیسے ان کے معصوم بیٹے کی جان لی۔ یہ خیال آتے ہی میں جیسے ابھی سے پسینے میں شرابور ہونے لگا تھا۔ ایک سوال نے پہلے ہی مجھے اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور اب اجمل کے ابا سے مل کر میں کسی اضطراب مسلسل میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میں یہ بھی سوچتا کہ اجمل کے ابا نے پولیس اسٹیشن پہنچ کر بیان تو دے ہی دیا ہے اور میں اب قانون کی گرفت سے بھی آزاد ہو چکا ہوں تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اپنے ان سوالوں کے جواب ڈھونڈتا پھروں' اپنا سکھ چین غارت کروں لیکن مجھے اجمل کی ماں' بہنوں کی بددعا لگ چکی تھی جو مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتی تھی۔ شاید اسی لیے میں ظہر کے بعد اجمل کے ابا کے کہنے کے مطابق اسی جگہ دکان پر جا پہنچا جہاں انہوں نے مجھے بلایا تھا۔

میں نے گاڑی دکان کے سامنے کھڑی کردی جہاں اس رات داؤد نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔ میں نے گاڑی سے اترنے سے پہلے ایک نظر دکانوں کی لمبی قطار کی جانب دیکھا' اب دن کے وقت تمام دکانیں کھلی ہوئی تھیں' میں نے گاڑی سے نیچے قدم رکھا سامنے اجمل کی دکان پر چند گاہک کھڑے تھے۔ میں وہیں ٹھہر کر گاہکوں کے جانے کا انتظار کرنے لگا پھر مجھے اجمل کے ابا دکھائی دیئے وہ اجمل کی طرح ویسی ہی جالی دار سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اجمل کی طرح ان کے چہرے پر بھی داڑھی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ عمر کے اب اس حصے میں ان کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ گاہک کب کے جا چکے تھے اور میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ جیسے خود میں ہمت جمع کررہا تھا۔ وہاں کھڑے میں کئی بار اس منظر کو دیکھ چکا تھا' جب میں نشے کی حالت میں اس دکان پر آیا تھا۔ اجمل اس وقت قرآن مجید کی تلاوت کررہا تھا' مجھے دیکھ کر اس نے قرآن مجید کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور پھر ایک جانب رکھ دیا۔ میں نے جو ماچس یا لائٹر مانگنے کے لیے اپنے لب ہلائے تو اسے میرے منہ سے آتی شراب کی بو ناگوار گزری' اس نے حقارت سے دھتکارتے ہوئے مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا اور ماچس دینے سے انکار کردیا۔ یہ دیکھ کر اگلے ہی پل میں نے ریوالور اپنی جیب سے نکال کر اس پر گولی چلادی۔ یہ خیال پھر سے ذہن میں آتے ہی مجھے لگا جیسے ابھی میرے کانوں نے پاس ہی کھڑی گاڑی میں موجود عبیرہ کی چیخ سنی ہو' وہ اس رات میرے گولی چلاتے ہی ڈر گئی تھی۔ ایسے ہی خیالات کو جھٹکتے ہوئے بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ میں دکان کی جانب بڑھا۔ میرے کاؤنٹر کے پاس پہنچتے ہی اجمل کے ابا

مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھتے ہوئے ان کے چہرے کے تاثرات میرے بیان سے باہر تھے۔ اس قدر شدید غصے اور حقارت سے انہوں نے مجھے دیکھا کہ میں نے اپنا سر جھکا دیا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑے قرآن مجید کو چوم کر آنکھوں سے لگا کر ایک طرف رکھا اور پھر کاؤنٹر سے کچھ اٹھانے کے لیے جھکے اور جب وہ سیدھے ہوئے تو یہ دیکھ کر جیسے میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی کہ ان کے ہاتھ میں وہی ریوالور تھا جس سے اس رات میں نے ان کے بیٹے اجمل پر گولی چلائی تھی۔ تو یہ پولیس کے ہاتھ اس لیے نہ لگا کہ یہ ریوالور اجمل کے ابا کے پاس تھا۔ میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ ”میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔“ فقط اتنا کہہ کر انہوں نے ٹریگر دبا دیا۔ پہلی گولی کے لگتے ہی میں لڑکھڑا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ریوالور میں بچی باقی کی تمام گولیاں بھی انہوں نے میرے سینے میں اتار دیں۔ میں زمین پر گرا تڑپنے لگا۔ میرا رواں رواں گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا اور میں ان اذیت ناک لمحوں میں اپنی روح کے جسم سے جدا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اجمل کے ابا نے اپنے بیٹے کے خون کا بدلا لے لیا۔ انہوں نے مجھے وہاں بلا کر اپنے سینے کی آگ کو بجھا لیا لیکن میں ابھی تک زندہ کیسے تھا؟ اجمل کے ابا نے تو سارا ریوالور مجھ پر خالی کر دیا' پھر ابھی تک مجھ میں جاں کیسے باقی تھی' میں سانس کیوں لے رہا تھا' میں ان لمحوں کی اس اذیت کو ابھی تک سہہ رہا تھا اور میری روح بھی کہ میرے تن کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ تھی اور میں اس قدر اذیت میں جیسے ایڑیاں رگڑنے لگا دفعتاً میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا' پسینے سے شرابور اب میں اپنے ہاتھوں سے اپنے سینے کو ٹٹولنے لگا۔ ابھی تو اجمل کے ابا نے گولیاں برسا کر میرے سینے کو چھلنی کیا تھا۔ ہوش میں آنے کے چند لمحوں تک بھی جیسے میں اس بھیانک خواب کی گرفت میں رہا۔

پھر کئی دن تک میں اس خیال سے کوسوں دور رہا کہ مجھے اپنے کسی سوال کے جواب کی خاطر اجمل کے ابا سے جا کر ملنا چاہیے' اسی دوران عدالتی کارروائی بھی مکمل ہوگئی اور مجھے اجمل کے قتل کی معافی مل جانے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے اس کیس سے بری کر دیا گیا۔ ابا کے الیکشن مزید قریب آ چکے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے دن رات اب اسی مہم جوئی میں گزرنے لگے تھے لیکن انہوں نے مجھے فی الحال اپنی سیاست سے الگ ہی رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے ہمراہ عوام کے سامنے جاؤں تو لوگ میرے ہاتھوں ہوئے قتل سے متعلق سوالات اٹھانے لگیں اور جس حادثے کو وہ عوام کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتے تھے ان کی یادداشت سے اسے مٹانا چاہتے تھے وہ میرے یوں سامنے آتے رہنے سے بار بار چرچے میں ہی رہے۔ ابا کو فقط اپنے الیکشن کی پروا تھی میری اس وقت ذہنی حالت کیسی ہو رہی تھی اس بات کی تو گھر میں کسی کو بھی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ماں' ابا کی سیاست میں برابر کی شریک تھیں۔ وہ خواتین کی نمائندگی کرتی' ابا کے ہمراہ رہتیں' بھائی کی شادی ہوگئی تھی اور بڑے ابا کی اب سنتا کون تھا۔ میں اپنے ہی آپ میں جیسے گم کہیں بہت دور نکلتا چلا جا رہا تھا اور اس بات کا جیسے کسی کو ادراک ہی نہ تھا۔

یونہی خیالوں ہی خیالوں میں' میں کئی بار خود کو پھانسی پر لٹکا چکا تھا۔ یوں موت کا خوف دھیرے دھیرے میرے اعصاب سے اترنے لگا تھا اور پھر ایک روز میں گاڑی لیے اپنے اس سوال کا جواب

جاننے کے لیے کہ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ جو شخص اب اس دنیا میں ہی نہیں اس نے مجھے معاف کردیا' میں اجمل کی دکان پر جا پہنچا تھا۔ میں نے گاڑی دکان کے سامنے کھڑی کی اور جب میں گاڑی سے اترا تو چند گاہک دکان پر موجود تھے' میں ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی کچھ ویسا ہی ہو رہا تھا جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے وہاں کھڑے کچھ وقت بیت گیا تو گاہک بھی اب اپنی ضروریات کی اشیاء لے کر جاچکے تھے۔ میں بھاری ہوتے قدم اٹھاتا آگے بڑھا جیسے میں سوچ رہا تھا کہ اجمل کے ابا اگلے ہی لمحے مجھ پر گولیاں برسا دیں گے' میں خوابوں کی تعبیر یا ان کی حقیقت سے بالکل بے خبر تھا لیکن اس رات دیکھے خواب سے خوفزدہ بھی بہت تھا۔ اب میں کاؤنٹر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اجمل کے ابا کو سلام کہنا چاہتا تھا لیکن میرے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست اب ملنے سے بھی قاصر تھے۔ اجمل کے ابا مجھے اپنے سامنے کھڑا پا کر ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ انہوں نے اسے چوما اپنی آنکھوں سے لگایا اور ایک طرف کو رکھ دیا لیکن پھر وہ کاؤنٹر کی جانب جھکے نہ تھے۔ ''کیوں یہاں اس جگہ آتے ہوئے خوف آرہا تھا' بڑے دن لگا دیئے یہاں تک آنے میں' یہی وہ جگہ ہے ناں اسی جگہ۔ جہاں میں کھڑا ہوں یہیں میرا اجمل کھڑا تھا' اس روز اور وہاں اس جگہ جہاں تم آج جیتے جاگتے کھڑے ہو اس روز بھی کھڑے تھے اور پھر تم نے میرے اجمل...... وہ اپنے بیٹے کو یاد کرتے ہوئے جیسے اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں انہیں کیا کہتا میں انہیں کیا دلاسہ دیتا۔ میں ان کے زخموں پر مرہم کیا رکھتا' میں ہی تو گھاؤ لگانے والا تھا۔

ان کی ایسی باتیں میرے وجود پہ بھی نشتر برسا رہی تھیں اور میں فقط سر کو جھکائے سنتا چلا جارہا تھا۔ پھر وہ اپنے سامنے موجود کاؤنٹر کی طرف جھکے اور اسی لمحے مجھے لگا جیسے میرا سانس چلنا رک گیا تھا لیکن درحقیقت خوف سے میں نے خود ہی اپنا سانس اس لمحے روک رکھا تھا' مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس رات دیکھا خواب اب بس سچ ہونے ہی والا تھا لیکن میں یہ دیکھ کر اب حیرت زدہ سا کھڑا تھا کہ اجمل کے ابا نے جب کاؤنٹر سے جھکے سر کو اٹھایا تو ان کے ہاتھ میں کوئی ریوالور نہ تھا' بلکہ ایک پرانا میلا سا گرد آلود اخبار تھا۔

''بڑی حیرت ہوئی تھی تمہیں یہ سن کر کہ اجمل تمہیں کیسے معاف کرسکتا ہے لیکن اب دیکھو اپنی آنکھوں سے دیکھو انہوں نے یہ کہتے ہوئے اخبار کا رخ پلٹ کر میرے سامنے کردیا۔ خون سے لکھا معاف اجمل کے دستخط کے ساتھ۔ میں جو ریوالور تانے اس کے سامنے کھڑا تھا پھر وہ ایک لمحے کا بھی کچھ وقت لگا ہوگا جب ٹریگر کے دبتے ہی خون کا ایک فوارہ اس کے وجود سے پھوٹ نکلا میں اس کا مجرم بھی اس کے سامنے کھڑا تھا وہ قاتل بھی اس کے سامنے کھڑا تھا جس نے ایک بے گناہ ہی نہیں بلکہ ایک معصوم انسان پر گولی چلادی۔ اس کا قصور فقط اتنا ہی تھا ناں کہ اسے میرے منہ سے آتی شراب کی بو ناگوار گزری تھی اور اس نے مجھے حقارت سے دھتکارتے ہوئے وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا اور میں نے اگلے ہی پل اس پر گولی چلادی اور وہ میرے ہی بہائے خون کی بوندوں سے معاف لکھتا رہا' میں کس قدر حقیر تھا' اس نے ثابت کردیا تھا۔ میں وہاں اجمل کے ابا کے سامنے اک پل مزید نہ ٹھہر سکا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب بڑھا اور میرے عقب سے

جانب سے ان کی آواز نے میرا پیچھا کیا۔ "میرے اجمل نے تمہیں معاف نہ کیا ہوتا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اجمل کا بدلا لیتا' میں تمہیں کبھی معاف نہ کرتا' میں نے تمہیں معاف نہیں کیا بلکہ میرے اجمل نے تمہیں معاف کیا ہے۔" میں وہاں سے گاڑی لے کر گھر پہنچا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ کر کنڈی لگا کر دیر تک روتا رہا اور میری نگاہوں کے سامنے وہی مناظر چلتے رہے جب میں نے اجمل پر گولی چلائی تھی کس قدر اذیت ناک وہ لمحے ہوں گے جب اپنے جسم کے گولی سے چھلنی ہوئے اعضاء سے رستے خون اور ان کی تکلیف دہ ٹیسوں کی پروا کیے بغیر وہ اخبار کے ٹکڑے پر انگلی سے معاف لکھتا رہا اور پھر یہ بھی ثابت کرنے کے لیے کہ وہ معاف اس نے اپنے پورے ہوش وحواس میں لکھا تھا سامنے اپنے دستخط بھی کردیئے۔ اس قدر ایذاء دینے والے شخص کو اور وہ اپنے ہی قاتل کو اپنی سانسوں کی ڈوری ٹوٹنے سے پہلے معاف بھی کرگیا۔ اجمل مجھے کیسے معاف کرسکتا تھا یارب اس نے مجھے معاف کیوں کیا؟ میرے ذہن میں یہی سوال بار بار اٹھتا رہا میں جو رو رہا تھا تو پھر قہقہے لگانے لگا اجمل نے مجھے معاف کردیا' اپنے ہی قاتل کو معاف کردیا۔ میں نے جو اس پر گولی چلائی تھی اس کے ماں ابا سے ان کا جوان سالہ اکلوتا بیٹا چھین لیا اس کی بہنوں سے ان کا اکلوتا بھائی چھین لیا اور اجمل نے مجھے معاف کردیا لیکن اجمل نے مجھے کیوں معاف کیا؟ اسی سوال کو دہراتے دہراتے میں سو جاتا اور جب اٹھتا تو میرے لبوں پر یہی کلمات ہوتے۔ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا بلکہ مجھے اجمل نے معاف کیا ہے' لیکن اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا' میں تو اس کا قاتل تھا' اس کا مجرم تھا پھر اس نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا؟ ایسے ہی کئی دن تک سورج طلوع اور غروب ہوتا رہا اور میں اسی حالت میں اپنے کمرے میں پڑا رہا جیسے جیسے وقت گزرتا رہا میں شعور سے اپنے لاشعور میں جا اترا اور وہاں بھی یہی سوال مجھے ستاتا رہا۔ ابا الیکشن کی تیاریوں میں مگن شہر شہر گھومتے رہے ماں اور بھائی بھی ان دنوں ابا کے ساتھ ہی رہتے ایسے میں کسی کو میرا خیال ہی نہ گزرا کہ میں کہاں ہوں' کس حال میں ہوں' ایک روز بڑے ابا کو جو میرا خیال آیا تو وہ میرے کمرے کی طرف آئے اور پھر جب میں نے آنکھ کھولی تو اپنے پاس سب سے پہلے جسے دیکھا وہ بڑے ابا ہی تھے۔ نہ جانے کتنے ہی روز بعد میں آج ہوش میں آیا تھا اور میرے لبوں پر وہی کلمات تھے "مجھے ......اجمل کے ابا نے...... معاف ......نہیں کیا...... بڑے ابا...... مجھے اجمل نے ...... معاف کیا ہے۔" وہ میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سن کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رو پڑے۔ "مجھے بڑے ابا...... اجمل نے معاف کیا ہے۔" بڑے ابا نے اگلے ہی پل بے اختیار مجھے اپنے سینے سے جو لگایا تو میں اپنے خشک حلق سے نکلتی گھٹی گھٹی آواز میں رو رہا تھا پھر بڑے ابا کی آواز مجھے جیسے کہیں دور کنوئیں کی گہرائی سے آتی محسوس ہوئی۔ میں نیم بے ہوشی میں انہیں ڈاکٹر کو پکارتا ہوا سنتا رہا اور پھر بے ہوش ہوگیا اور جب پھر دوبارہ مجھے ہوش آیا تو گھر کے سبھی لوگ میرے اردگرد موجود تھے۔ اپنے بازو میں درد محسوس کرنے پر میں نے جو اپنے بائیں جانب دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں اتنی سکت بھی نہ بچی تھی کہ میں اپنا سر ہی ہلا پاتا۔ بڑی مشکل سے جو میں نے اپنی گردن کو ذرا سا خم دیا تو مجھے پتا چلا کہ بازو پر لگی ڈرپ سے مجھے خون دیا جارہا تھا۔ میری نظر جو خون کی بوتل پر پڑی تو ایک دم سے وہ اخبار کا وہی ٹکڑا بن گئی جس پر اجمل نے مرنے سے

پہلے اپنے خون سے معاف لکھا تھا۔ مجھے لگا میرے جسم میں قطرہ قطرہ اترنے والا خون اسی اخبار میں سے ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ میں نے ذرا اپنے جسم کو ہلانے جلانے کی کوشش کی لیکن میں ایسا نہ کر سکا‘ میرے لب جواب کانپتے ہوئے ہلنے کی جستجو میں تھے۔ میں ان سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا‘ مجھے اجمل نے معاف کیا ہے۔ ان دنوں بڑے ابا دن رات میرے سرہانے بیٹھے رہتے‘ اور مجھے ذرا ہوش آتا تو وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے‘ میں جو بھی بولتا وہ میری ہر بات سنتے اور مجھے تسلیاں دیتے رہتے۔ ان کی خدا کے حضور گڑگڑا کر مانگی دعاؤں اور تیمارداری سے میں جلد ہی اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتے اور پھر مجھ پر پھونکوں سے دم کرتے رہتے‘ جلد ہی میں سے گھر منتقل ہو گیا تھا۔ الیکشن اب قریب آچکے تھے۔ بڑے ابا کے علاوہ گھر کے سبھی لوگ ان دنوں بے حد مصروف تھے۔ گھر سے ملحقہ ہی الیکشن سیل تھا لیکن اب الیکشن کے قریبی دنوں میں گھر بھی الیکشن سیل بنا ملاقات کے لیے آئے حضرات سے بھرا رہتا تھا۔ بڑے ابا جو تیمارداری کے لیے ہمہ وقت میرے پاس کمرے میں ہی رہتے تھے‘ اور فقط ایک مخصوص وقت میں ہی وہ مجھے اپنے ساتھ چہل قدمی کے لیے لے جاتے تھے۔ ایک روز یوں ہوا کہ وہ کافی دیر تک کمرے میں میرے پاس نہ آسکے۔ وہ مجھے سوتا چھوڑ کر گئے تھے لیکن ان کے جانے کے بعد جو میری آنکھ کھلی تو پھر مجھے نیند نہ آسکی‘ میں جو اٹھ بیٹھا تھا تو کچھ دیر دائیں بائیں دیواروں سے ہی باتیں کرتا رہا۔ اب مجھے کمرے میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے قریب کوئی بھی نہ تھا اور میرے لبوں پہ یہی کلمات تھے کہ...... مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا‘ وہاں اس وقت مجھے تسلی دینے والا کوئی ناں تھا شاید اسی لیے میں نے دروازہ کھولا اور پھر راہداری میں سے ہوتا ہوا جو کھلے صحن میں پہنچا تو سامنے لان میں میری نظر اپنے ابا پر پڑی وہ اس وقت الیکشن کے سلسلے میں آئے اپنے چند خاص مہمانوں سے ملاقات کر رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک شہر کی مشہور شخصیات تھیں۔ اپنے ابا پر نظر پڑتے ہی میں تیز تیز قدم بھرتا ان کے پاس جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی میں زور زور سے چلانے لگا۔ ”ابا...... ابا میں آپ کو بتانے آیا ہوں کہ مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا۔“ یہ سنتے ہی میرے ابا کے ساتھ ساتھ وہاں بیٹھے سبھی لوگ حیرت سے مجھے تکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”ابا مجھے بتانا ہے‘ مجھے بتانے دو۔“ ابا میرا بازو تھامے مجھے وہاں سے میرے کمرے کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

”ابا! مجھے اجمل نے معاف کیا‘ انکل آپ کو پتہ ہے‘ مجھے کس نے معاف کیا......؟ مجھے اجمل نے معاف کیا ہے...... ابا مجھے اجمل نے معاف کیا ہے...... مجھے اجمل کے ابا نے معاف نہیں کیا۔“ ابا جو میری ایسی حالت کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ میں ان کے لیے شرمندگی کا باعث بن رہا تھا۔ ابا کے ساتھ ساتھ اب چند ملازم بھی آگئے‘ وہ سبھی مل کر اب مجھے دھکیلتے ہوئے میرے کمرے کی طرف لے جا رہے تھے اور میں تھا کہ ان کے قابو میں ہی نہ آ رہا تھا۔ میں ان کی گرفت سے آزاد ہو کر پھر سے ابا کے مہمانوں سے جا مخاطب ہوتا اور وہ میری ایسی حالت دیکھ کر ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے پھر یہ شور سن کر کہیں سے بڑے ابا وہاں آ پہنچے اور وہ مجھے تسلیاں دیتے میری باتوں کا جواب دیتے ہوئے مجھے میرے کمرے میں لے آئے۔ ڈاکٹر اب گھر پر

ہی میرے علاج کے لیے مامور تھے' میرے کمرے میں پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھے انجکشن لگایا تو اس کے زیر اثر مجھ پر نشہ ساطاری ہونے لگا اور یوں میں پھر سے غنودگی میں اترنے لگا۔ ایسی ہی حالت میں پھر کئی دن گزر گئے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا جب انہی دنوں میں ابا کے الیکشن ہار جانے کی وجہ سے سارے گھر پر جیسے پژمردگی سی چھا گئی تھی۔ ابا نے یہ الیکشن جیتنے کے لیے اپنا روپیہ پیسہ اور دن رات لگادیئے تھے لیکن کامیابی اس بار کسی اور کا مقدر تھی۔

میرے ہاتھوں ہونے والے قتل اور پھر میڈیا میں جس طرح سے اسے اچھالا گیا تھا' یہ بھی ابا کی ہار میں ایک بڑی وجہ ثابت ہوا تھا پھر میری دماغی حالت کے بگڑنے سے بھی ان کی ساکھ متاثر ہوئی تھی۔

بڑے ابا کی دیکھ بھال اور اعلیٰ ترین ڈاکٹرز کی خدمات سے میری حالت روز افزوں بہتر ہو رہی تھی اور پہلے جو میں ایک ہی بات کو دہراتا رہتا تھا اب اس کی جگہ خاموشی نے لے لی تھی لیکن ایسا نہ تھا کہ اب میں کچھ سوچتا نہ تھا بلکہ ظاہراً دکھائی پڑتے سکوت کے پیچھے دراصل ایک تلاطم بپا تھا۔

اکثر میں بیٹھا سوچتا کہ قانون اگر مجھے کوئی سزا دیتا تو وہ میرے لیے سزائے موت ہوتی پھانسی کے پھندے سے جھول کر چند لمحے میرے پیر ہوا میں جھولتے اور میں چاہتا کہ مجھے کوئی سہارا مل جائے' کوئی فرش میرے ہوا میں لہراتے پیروں تلے آجائے' جو مجھے ان لمحوں کی اذیت سے بچالے اور اسی کشمکش میں میری گردن یوں لمبی ہوجاتی اور پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر قسم کی اذیت سے آزاد ہوجاتا' لیکن اجمل نے میرے لیے جس سزا کا انتخاب کیا تھا' وہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر ہر لمحہ سزائے موت تھی۔ قانون مجھے فقط ایک سزائے موت دیتا' لیکن اجمل میرے لیے چوبیس گھنٹوں کے حساب سے ایک ایک پل میں سیکڑوں سزائے موت منتخب کر گیا تھا۔ سانس لیتے ہوئے ہر ہر پل مرنا کس قدر تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ اس اذیت کو سہتے ہوئے کبھی میرا جی چاہتا میں خود پھانسی لے لوں یا اجمل کے ابا کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ مجھے اپنے بیٹے کی موت کے بدلے اپنے ہاتھوں سے ماردیں۔ اسی ارادے سے ایک روز میں ان کے پاس جا پہنچا لیکن پھر اجمل کے ابا میرے سامنے اخبار کا وہی گرد آلود ٹکڑا لے آئے جس پر اجمل سانسوں کی ڈوری ٹوٹنے سے پہلے اپنے خون سے معاف لکھ گیا تھا۔ اس سارے عرصے میں داؤد اور عبیرہ نے ایک بار بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کی تھی۔ داؤد کو تو میں اسی روز پہچان گیا تھا جب وہ مجھے تنہا چھوڑ کر جیپ اسٹارٹ کرکے فرار ہوگیا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے عبیرہ کو لے کر ایک امید باقی تھی کہ ہوسکتا ہے' میری چاہت کا ابھی کوئی اثر اس میں باقی ہو' پھر اپنے درد کو ذہنی اضطراب کو بیان کرنے کے واسطے میں نے عبیرہ سے ملنے کی کوشش کی۔ پہلے تو میں فون کرتا رہا لیکن اس کا نمبر بند ملا اور پھر جب اس سے اس کے گھر جا کر ملنے کی کوشش کی تو مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ بھی داؤد کے ساتھ مل چکی تھی اور پھر میرے درد میں جب عبیرہ کی بے وفائی کا درد بھی آملا تو میں ایک دم سے بکھر گیا' میری اب کی بار جو حالت بگڑی تو ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ بگڑتی ہی چلی گئی۔

شہر کے ایک بڑے اسپتال کے وی آئی پی روم میں میرے بے حس و حرکت پڑے وجود میں ڈرپس لگائی جاتی رہیں' ہر روز نیا ٹیسٹ ہوتا اور اس ٹیسٹ رپورٹ کا رزلٹ نیگیٹو ہی ملتا۔ ڈاکٹر مجھے لاحق مرض کو کھوجنے میں ناکام ہوچکے تھے۔ پھر بھی مجھے بہتر نگہداشت کے لیے اسپتال سے گھر منتقل نہیں

کیا گیا تھا اور جیسی میری حالت تھی ایسے میں ڈاکٹر مجھے چلے جانے کی اجازت بھی نہ دے سکتے تھے۔ میرے ابا جو میرے علاج کے لیے روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہا رہے تھے اب مجھے علاج کی خاطر بیرون ملک لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر حضرات نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ اب اس حالت میں مجھے علاج کے لیے بیرون ملک لے جانے میں میری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ دن تھے جب بابا عبدالقادر ایک روز بڑے ابا سے ملے اور انہیں بتایا کہ وہ ایک اللہ والے کو جانتے ہیں جن کے پاس بڑی تعداد میں خلق خدا آتی ہے اور وہ جس کے لیے دعا فرما دیتے ہیں اللہ اسے شفا عطا کر دیتا ہے۔ بابا عبدالقادر بڑے ابا سے یہ کہتے ہوئے رو پڑے۔ بچپن سے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہم دونوں بھائیوں کو پالا پوسا تھا۔ اب مجھے یوں موت کے منہ میں جاتا دیکھ کر وہ اپنے جذبات پہ قابو نہ رکھ پائے تھے۔ بابا عبدالقادر کی بات بڑے ابا کے دل کو لگی تھی۔ جہاں انہوں نے ہر طرح کے علاج آزما لیے اور بہتری کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی اب یوں بابا عبدالقادر کے کسی اللہ والے کا نام لینے پر جیسے ان کے دل میں ایک امید کی کرن جاگی تھی۔

پہلے وہ مجھے اسپتال سے گھر لے آئے اور جب مجھے گھر منتقل کیا گیا تو گھر کے لوگوں کی حالت ایسی تھی جیسے اسپتال سے میری لاش گھر پہنچی ہو۔ ماں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھیں۔ بھائی' بھائی' ابا' عبدالقادر' مائیکل' بڑے ابا سبھی میری قریب المرگ حالت دیکھ کر یوں رو پڑے تھے جیسے انہیں میرے بچنے کی اب کوئی امید دکھائی نہ دے رہی تھی۔ مجھے یہ سب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بے حس وحرکت پڑا خواب میں لاشعوری کیفیت میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جیسے میرے ذہن کے سلولائیڈ پر یہ سبھی خاکے پرچھائیوں کی طرح ابھر رہے تھے۔

بڑے ابا نے سبھی کو دعا کرنے کو کہا اور انہیں بتایا کہ وہ مجھے کسی اللہ والے کے در پر لے جا رہے ہیں۔ مجھے اسٹریچر پر ڈال کر گاڑی میں سوار کیا گیا اور جاتے جاتے بڑے ابا نے اماں سے ایک بار پھر کہا کہ وہ میرے لیے دعا کریں' ایسا کہتے ہوئے بڑے ابا بھی جیسے آبدیدہ ہو گئے تھے۔ سفر لمبا تھا اور یوں وہ ماں کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے ابا اور بھائی کو بڑے ابا نے اس لیے روک دیا تھا کہ وہ اللہ والے کے در پر فقیروں کے بھیس میں جانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ابا اور بھائی بڑی بڑی عالیشان گاڑیوں میں لمبی قطاریں بنا کر ان کے ہمراہ چلیں۔

پھر جو سفر کا آغاز ہوا اور ایک طویل سفر کے بعد ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچے تو میرے اسٹریچر کو بابا رب نواز کے حجرے سے باہر کھلے صحن میں رکھ دیا گیا۔ وہاں پڑے کچھ ہی لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وجود میں جل رہی آگ ایک دم سے سرد پڑ گئی ہو۔ دفعتاً میری قوت سماعت سے کچھ آوازیں ٹکرائیں۔ ''بابا جی آ گئے...... بابا جی آ گئے۔'' میں نے جیسے ہی یہ آوازیں سنیں نہ جانے کہاں سے ایک ایسی لاہوتی خوشبو میرے نتھنوں سے داخل ہو کر میرے دل ودماغ میں سکون وراحت کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں جا اتری جو میرے بیان سے باہر تھیں۔

مجھے نہیں یاد کہ بابا رب نواز میرے سرہانے کھڑے کیا پڑھ کر دم کرتے رہے' جب میری آنکھ کھلی اور میرے لب ہلے تو میری زبان پر وہی کلمات تھے۔ ''اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا؟'' بڑے ابا مجھے اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھا کر بٹھائے ہوئے تھے اور جو ہستی میرے روبرو براجمان تھی ان کے لبوں پر اک ایسی ملکوتی مسکراہٹ تھی جسے دیکھتے ہی میں ایک

دم سے یوں دھاڑیں مارے رونے چلانے لگا تھا اور میرے لبوں پر وہی کلمات تھے۔ "کہ اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا؟" بابا رب نواز دھیرے سے ذرا سے میرے قریب آئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے جو کلمات انہوں نے کہے میں انہیں سن کر یوں چپ ہو گیا جیسے کسی سوالی کی جھولی یوں بھر دی گئی ہو کہ پھر وہ آسودہ حال ہو کر لوٹا دیا گیا ہو۔

"بہت بھوک لگ رہی ہوگی میرے بچے۔" انہوں نے بدستور مسکراتے ہوئے یوں اپنائیت سے میری جانب دیکھ کر کہا اور ساتھ ہی اپنے کسی شاگرد کو آواز دی اور وہ وہیں سے اپنے ہاتھ میں ایک مٹی کا کوجا (یا کوزا......؟) لے کر حاضر ہو گیا۔ بابا رب نواز نے اپنے ہاتھوں سے اس پر بندھے کپڑے کو ہٹایا۔ "لو میاں کھاؤ بھوک بھی مٹ جائے گی اور کمزوری بھی رفع ہو جائے گی۔" میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ان کے ہاتھ سے مٹی کا کولیا' بھوک اس قدر شدید تھی کہ کوجا گود میں رکھتے ہی میں نے ہاتھ کوجے میں ڈالا ٹھنڈی خوشبودار فرنی جیسی کوئی چیز جو میرے ہاتھوں کو لگی تو میں اپنے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر اسے کھانے میں جت گیا۔ چہرے اور کپڑوں کی پروا کیے بغیر میرا ہاتھ اس وقت ہی رکا جب کوجا پوری طرح سے خالی ہو چکا تھا اور میں اپنی انگلیوں کو چوستے ہوئے صاف کر رہا تھا۔ وہ طہٰ عالم جو کانٹینیٹل کھانوں کا عادی تھا اور پھر کھاتے ہوئے کیا مجال جو ہاتھ کھانے کو چھوتا کانٹے' چاقو اور ٹشو کا استعمال کس ناز و انداز سے کرتا تھا آج وہی طہٰ عالم بابا رب نواز کے حجرے سے باہر کھلے صحن میں مٹی کے کوجے میں ہاتھ ڈالے فرنی کھاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو زبان سے صاف کر رہا تھا۔ بڑے بڑے عظیم و عالیشان محلات میں رہنے والوں اور بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومنے والوں کو بھی اس رب العزت کو انسان ہونے کا احساس دلانا اچھے سے آتا ہے۔ اپنی زبان سے انگلیاں صاف کرتے ہوئے میں نے پہلی بار اپنے گردونواح پر ایک نظر دوڑائی فقط میں ہی اسٹریچر پر موجود نہ تھا بلکہ میرے اردگرد سیکڑوں لوگ موجود تھے جو بھی کھلے صحن میں فرش پر بیٹھے تھے' میری نظر بڑے ابا پر پڑی وہ میرے عقب میں ہی کھڑے تھے اور ان کے ہمراہ بابا عبدالقادر بھی موجود تھے۔ انہوں نے اشارتاً میرا حال دریافت کیا۔ انہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ وہ مجھے بھلا چنگا بیٹھا دیکھ کر خوشی سے اپنے اوپر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں اٹھنا چاہتا تھا بڑے ابا اور بابا عبدالقادر دونوں آگے بڑھے' میں آج کئی روز بعد اپنے پیروں پر یوں کھڑا ہو سکا تھا اور اب بے اختیار روتے ہوئے کبھی بڑے ابا تو کبھی بابا عبدالقادر کے گلے لگ جاتا تھا۔ یونہی کافی دیر تک میں روتا رہا۔

ہم لوگ یہاں عصر کے بعد پہنچے تھے اور اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ آج میرے زوال کا یہ آخری سورج غروب ہو رہا تھا۔ آج مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا' بڑے ابا کہنے لگے کہ باباجی کا پیغام ہے کہ میں ابھی سے نماز بھی شروع کر دوں۔ اب مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ بڑے ابا اپنے ساتھ میرے چند کپڑے بھی لائے تھے۔ فرنی کھاتے ہوئے میرے کپڑے خراب ہو چکے تھے۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر بڑے ابا اور بابا عبدالقادر کے ساتھ میں نے بھی وضو کرنے کے بعد بابا رب نواز کے ساتھ جماعت کے ساتھ ادا کی۔ مجھے اس روز ادا کی نماز کا ایک ایک سجدہ زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ میرے احساس ندامت سے بہائے آنسوؤں نے مجھے یوں سر تا پا بھگو ڈالا تھا اور سلام پھیرتے ہی میں خود کو یوں ہلکا محسوس کرنے لگا تھا جیسے منوں بھاری کوئی بوجھ

میرے دل ودماغ سے اتر گیا ہو۔

......☆☆☆......

دفعتاً میرے کانوں سے ریل گاڑی کی چیختی چنگھاڑتی آواز ٹکرائی۔ ٹرین پلیٹ فارم چھوڑتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے نکل چکی تھی۔ یومنہ میرے ساتھ بینچ پر بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ نہ ہی وہ ٹرین کے چھوٹ جانے پر بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور نہ ہی میں اپنی جگہ سے ہلا تھا۔ ہم دونوں ہی کچھ وقت تک چپ چاپ خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم برسوں کے سفر سے لوٹے تھے اور کچھ وقت کے لیے ذرا پاؤں پسار کر ذرا استراحت کو بیٹھے تھے۔ ''یومنہ آپ کی ٹرین تو چھوٹ گئی۔'' اب کی بار میں جو یومنہ سے مخاطب ہوا تو وہ یوں بوکھلا کر میری جانب متوجہ ہوئی اسے وہیں اسی حالت میں بیٹھا چھوڑ کر میں یہ پتہ کرنے نکل گیا کہ اگلی ٹرین کی روانگی کن اوقات میں ہوگی پھر پتہ کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ آج کے دن جہانیاں آباد کے لیے یہ ٹرین کی روانگی کا دوسرا وقت تھا اور اب اگلی ٹرین کی روانگی چھ سے آٹھ گھنٹوں کی تاخیر سے ہوگی۔ جسے سن کر مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں جو اپنا یادوں کا پٹارا کھولے بیٹھ گیا تھا تو میری وجہ سے یومنہ کی ٹرین چھوٹ گئی اور اب واپس اسی جانب بڑھتے ہوئے جہاں بینچ پر یومنہ بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی' میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہونا چاہیے؟ میری وجہ سے جو اس کی ٹرین چھوٹی تھی تو اب مجھے ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا تھا۔ چھ سے آٹھ گھنٹے اب ہم یہیں اسٹیشن پر نہیں گزار سکتے تھے اور واپس لوٹ جانے کا خیال بھی مجھے مناسب نہ لگا تھا اور جب میں یومنہ کے پاس پہنچا 'میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میں خود اپنی گاڑی پر اسے جہانیاں آباد تک چھوڑنے جاؤں گا۔ اس کے پاس پہنچ کر میں نے اسے اگلی ٹرین کی روانگی کا وقت بتایا اور ساتھ ہی اپنی تجویز پیش کی تو میری بات سن کر جیسے وہ میری تجویز پہ غور کرنے لگی تھی۔ اسے یونہی خیالوں میں گم چھوڑ کر میں گاڑی کی جانب بڑھا اس کا سامان ابھی تک میری گاڑی میں ہی رکھا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ہارن بجایا تو وہ گویا چونکتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھی اور بنا بات کیے پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چھ سے آٹھ گھنٹے کی تاخیر سے اگلی ٹرین نے روانہ ہونا تھا جبکہ یہاں سے جہانیاں آباد چار سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اب میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے میرے ماضی کی داستان سن کر یومنہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ وہ اب سے پہلے سنی سنائی باتیں ہی سنتی آئی تھی اب میری زبانی میرا ماضی جان کر اسے کیسا لگا ہوگا' پھر میں نے سوچا میں اس سے پوچھوں کہ اسے میری ساری داستان سننے کے بعد مجھ سے خوف تو محسوس نہیں ہو رہا' لیکن میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ پچھلی نشست پر بیٹھی بیٹھی سو چکی تھی۔ مجھے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دو سوا دو گھنٹے ہو رہے تھے لیکن اس بیچ اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے ایک جگہ پٹرول ڈلوانے کی غرض سے میں نے جو بریک لگائی تو مجھے اس کا سوال سن کر اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ اس جگہ کا نام پوچھ رہی تھی جس جگہ ہم اس وقت کھڑے تھے۔ میں نے اسے جگہ کا نام بتایا اور اسے کہا کہ ہم گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ پٹرول ڈلوانے کے بعد میں اس کے لیے پٹرول پمپ سے ملحقہ کینٹین سے کچھ کھانے پینے کی اشیاء خرید لایا اور پھر خود بھی ایک ٹن پیک کھول کر پیتے ہوئے میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گھنٹے

ڈیڑھ کے اندر ہی میں یومنہ کے گاؤں جہانیاں آباد میں داخل ہوا تو مجھے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ چچا کا یہاں گھر کون سا تھا۔ چچا کی کئی ایکڑ پر پھیلی حویلی گاؤں میں داخل ہوتے ہی دور سے ہی دکھائی پڑتی تھی۔

یومنہ سے بڑی آمنہ کا جو ماں نے رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا تو اس سے بھی پہلے میرے ابا اور چچا کے کچھ اختلافات موجود تھے شاید اسی لیے انہوں نے بیٹی کے رشتہ سے ہی پرانی رنجشوں کو مٹانے کی کوشش کی تھی لیکن تب ماں نے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا تو تعلق پھر سے پرانے انداز سے ہی آگے بڑھتے رہے۔ میں نے گاڑی گھر سے پہلے کچھ فاصلے پر ہی روک دی اور یومنہ سے کہا کہ وہ اب مجھے اجازت دے۔ میری یہ بات سنتے ہی جو وہ پہلے سارا راستہ چپ چاپ بیٹھی رہی تھی اب ایک دم سے غصے سے پھٹ پڑی اور تب تک اس نے گاڑی سے نیچے قدم نہ رکھا جب تک میں نے گھر چلنے کے لیے ہامی نہ بھرلی۔ لامحالہ میں نے گاڑی آگے بڑھا تو دی لیکن میں سوچتا رہا کہ جانے چچا مرزا میرے یوں غیر متوقع طور پر یومنہ کو چھوڑنے کے لیے آنے پر کیسا محسوس کریں گے اور پھر اگلے ہی لمحے نے مجھے احساس دلا دیا کہ میں نے یومنہ کو گھر چھوڑنے کے لیے آنے میں کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔ گھر پر اس وقت صرف چچا اور چچی ہی تھے۔ میرے اپنے سگے چچا سے زیادہ اخلاق سے تو مجھے چچی ملی تھیں۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا' مجھے دعا دی اور چچا یومنہ کو ساتھ لیے آگے بڑھتے ہوئے جو سرزنش کر رہے تھے تو وہ دبی دبی آوازیں میرے کانوں نے واضح سنی تھیں' وہ بار بار اس سے یہی پوچھ رہے تھے کہ وہ ٹھیک تو ہے اور اگر اس کی ٹرین چھوٹ ہی گئی تھی تو اسے گھر سے اس کا کوئی بھائی لینے آ جاتا' ایسی کیا مصیبت آن پڑی تھی اگلے روز بھی آیا جا سکتا تھا' میں چچی کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر ہی چچا اور یومنہ کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور میرا جی اس وقت یہی چاہ رہا تھا کہ میں الٹے پیروں یہاں سے لوٹ جاؤں لیکن میں فقط یومنہ کا دل رکھنے کی خاطر یہ سب برداشت کرتا رہا۔ چچی نے مجھے ایک ملازم کے ساتھ ایک طرف مہمان خانے کی جانب بھیج دیا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بے حد شرمندہ لگ رہی تھیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ یومنہ اور چچا کے بیچ ہونے والی باتیں میں نے سن لی تھیں پھر وہ خود بھی چچا اور یومنہ کے ساتھ چلی گئیں اور میں ملازم کے ساتھ مہمان خانے میں چلا آیا۔ مستطیل نما ایک لمبے ہال میں دو بستر لگے تھے جن میں سے ایک پر بیٹھتے ہی بیزاری سے میں اٹھ کھڑا ہوا اور اب کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف ٹہلتے ہوئے مجھے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا جب میرے دونوں چچا زاد بھائی اور ایک ملازم ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

''لاؤ بھئی پانی دو مہمان کو۔'' اندر داخل ہوتے ہی فرزند نے کہا اور پھر فرزند اور دلدار دونوں بھائیوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور گھر کے لوگوں کا حال پوچھنے لگے۔ وہ دونوں بھائی مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن شاید گاؤں کے ماحول کا اثر تھا یا بے فکری کی زندگی نے انہیں کچھ اس طرح سے بڑھا پھلا دیا تھا کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ میرے سگے چچا زاد تھے لیکن آج برسوں بعد میں ان سے مل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دوریاں' مسافتیں فاصلے چاہے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں اگر دلوں میں سچا خلوص ہو تو یہ دوریاں' مسافتیں' فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن اگر دلوں میں ہی نفرتوں کی فصلیں کھڑی کر رکھی ہوں تو قربتیں بھی ان

فصیلوں کو پھلانگ کر دلوں تک نہیں پہنچ سکتیں۔
ان کے رویے سے اگر مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ انہیں مجھ سے مل کر کوئی کسی قسم کی خوشی محسوس نہ ہوئی تھی تو مجھے بھی ان کے درمیان بیٹھ کر کوئی بہت اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں ان سے واپسی کے لیے کسی محفوظ راستے کے بارے میں دریافت کرنے لگا جسے سن کر دلدار نے بتایا کہ رات ہوتے ہی یہ علاقے بالکل غیر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یوں میرے لیے اب فوراً واپسی کے دروازے بند ہو گئے تھے اور میرا جی وہاں اک پل ٹھہرنے کو نہ چاہ رہا تھا۔ میں ان دونوں بھائیوں کے ساتھ بیٹھا بھی جیسے گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ جب ایک ملازم کھانا لے آیا۔ فرزند اور دلدار دونوں نے کھانا میرے ساتھ ہی کھایا اور کچھ دیر مزید بیٹھ کر وہ چلے گئے۔ کھانے کے بعد میں کافی دیر تک جاگتا رہا کہ ہو سکتا ہے کہ چچا، چچی یا یومنہ میں سے کوئی مجھے وہاں ملنے چلے آئیں لیکن جب کافی دیر تک وہ نہیں آئے تو میں سونے کی غرض سے لیٹ گیا۔ ایک طویل سفر طے کر کے آنے کے باوجود مجھے وہاں چچا کی حویلی کے اس لمبے مستطیل نما کمرے میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر مجھے یومنہ کا خیال آنے لگا کہ چچا یومنہ سے خفا ہو رہے ہوں گے میں جانتا تھا کہ چچا مجھے کوئی اچھا انسان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ میں ایک قاتل ہوں اور ایک قتل جیسے فعل کے مرتکب مجرم کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کا اٹھنا بیٹھنا کبھی گوارا کر سکتے تھے۔ ان کے پھر مجھ سے ملنے نہ آنے کے پیچھے بھی یہی وجہ تھی۔ چچا طبیعت کے کچھ زیادہ ہی سخت واقع ہوئے تھے فقط آمنہ کے رشتے کی وجہ ہی ہمارے خاندانوں کے درمیان رنجش کی وجہ نہ تھی اس سے پہلے جب چچا نے مستقل طور پر گاؤں میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی تب انہیں ان زمینوں پہ کام شروع کرنے کے لیے کافی رقم درکار تھی، وہ چاہتے تھے کہ شہر میں موجود اپنا حصہ وہ فروخت کر دیں اور اس پیسے سے وہ کام شروع کر لیں لیکن جب بڑے ابا کو چچا مرزا کی یہ خواہش پتہ چلی تو وہ بہت خفا ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر چچا زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے خاندان کے ساتھ گاؤں چلے ہی گئے ہیں تو وہ شہر میں موجود پراپرٹی فروخت نہ کریں، لیکن چچا بضدر ہے ان دنوں ابا نے نیا نیا سیاست میں قدم رکھا تھا، میرے ابا کو بھی پیسے کی ضرورت تھی، وہ اتنی رقم چچا کو نہیں دے سکتے تھے کہ جس سے وہ گاؤں میں اپنا کام آرام سے جاری رکھ سکیں۔ انہی دنوں چچا نے سب کی مخالفت کے باوجود اپنے حصے کی پراپرٹی فروخت کر دی تھی اور تبھی سے دلوں میں چاہت کی جگہ نفرتوں نے لے لی تھی۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھی کم نہ ہوئی تھیں اور آج یومنہ کو یہاں چھوڑنے کے لیے آنے کے بعد میں نے انہیں محسوس بھی کیا تھا۔ رات دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی پھر رات کے آخری پہر اچانک ٹرین کی سیٹی کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ جہانیاں آباد کا ریلوے اسٹیشن گاؤں کے قریب ہی تھا۔ گاڑی مسافروں کو لینے پل دو پل رکی اور پھر سیٹی بجاتی آگے بڑھ گئی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے لگا۔ نماز ادا کرنے کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نماز کے بعد پھر سے بستر پر ذرا استراحت کو لیٹ گیا اور پھر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی۔ ابھی مجھے آنکھ لگے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا جب ایک ملازم نے مجھے آ کر جگا دیا۔ وہ میرے لیے ناشتہ لایا تھا۔ گاؤں میں لوگ صبح سویرے ہی ناشتہ کر لینے کے عادی ہوتے ہیں لیکن مجھے ابھی کوئی بھوک محسوس نہ ہو رہی تھی۔ ملازم ناشتہ رکھنے کے بعد چلا گیا لیکن

پھر مجھے دوبارہ نیند نہ آئی۔ میں نے جو وقت دیکھا تو اب سوا نو ہو رہے تھے۔ میں جو کہ اس طرح کے ماحول میں رہنے کا عادی نہ تھا تو میں رات کو ہی واپس لوٹ جانا چاہتا تھا پھر مجبوراً جو مجھے یہاں رات بسر کرنا ہی پڑی تو اب میں مزید رکنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے پھر جھٹ سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کرنے کی غرض سے جوڑے پر سے کپڑا ہٹایا تو نیچے ایک تہہ لگا کاغذ کا ٹکڑا پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے اسے کھولا۔ ''صبح بخیر'' اوپر آدھے صفحے پر بڑا سا درج تھا۔ جسے دیکھ کر میں مسکایا تو یہ یومنہ تھی پھر میں نیچے کی سطریں پڑھنے لگا' وہ مجھ سے معذرت خواہ تھی اور اپنے ابا کی طرف سے بھی معافی مانگ رہی تھی۔ میں نے اس صفحے کو اپنی جیب میں رکھا اور ناشتہ کرنے لگا۔ میرے ناشتہ کر لینے کے تھوڑی دیر بعد ہی چچی میرے کمرے میں آئیں' وہ مجھ سے بڑے اخلاق سے دریافت کرنے لگیں کہ مجھے یہاں رات بسر کرنے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی تو پیش نہیں آئی۔ ان کے ایسا دریافت کرنے سے ہی جیسے میری رات بھر کی تھکن اتر گئی تھی اور میں سوچنے لگا کہ خوش اخلاقی بھی کیسا حسین زیور ہے۔ خوش اخلاق انسان فقط دو میٹھے بولوں سے کسی بھی انسان کو جیت سکتا ہے۔ پھر وہ مجھے اپنے ہمراہ لیے باہر نکلتے ہوئے بتانے لگیں کہ میرے چچا اور دونوں بھائی صبح ہی کھیتوں میں چلے جاتے ہیں اور پھر دوپہر کے قریب ہی لوٹتے ہیں۔ وہ مجھے ان کے لوٹنے تک رکنے کا کہنے لگیں تو میں نے معذرت کر لی۔ مہمان خانے سے نکل کر اب ہم حویلی کے احاطے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حویلی کے سامنے پھیلے وسیع رقبے کو کئی قسم کے پیڑ پودے اور پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ جو کہ حویلی کے حسن کو مزید بڑھا رہا تھا۔ ہم ذرا اور آگے بڑھے تو دور بڑے بڑے پنجروں کی لمبی قطار کے پاس یومنہ کھڑی مجھے دور سے ہی دکھائی دی۔ وہ پرندوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ چچی مجھے بتانے لگیں کہ یہ سارے پرندے یومنہ کی فرمائش پر ہی رکھے گئے ہیں اور حویلی کے وسیع رقبے پر پھیلے پیڑ پودوں کی دیکھ بھال بھی یومنہ ہی اپنی زیر نگرانی کرواتی ہے۔ ہمارے ذرا قریب پہنچتے ہی اس نے بھی ہمیں آتا دیکھ لیا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی دانے دنکنے والی ٹرے نیچے رکھتے ہوئے ہماری طرف بڑھی پھر یومنہ اور میں باتیں کرنے لگے اور چچی یہ کہہ کر چلی گئیں کہ وہ چائے لے کر آتی ہیں۔ چچی کے جانے کے بعد ہم تھوڑی دیر وہیں بیٹھے رہے پھر یومنہ مجھے اپنے پرندے دکھانے لگی۔ پنجروں کے پاس سے گزرتے ہوئے میں جو ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈال رکھا تھا تو وہ کاغذ کا ٹکڑا ابھی میری جیب میں ہی تھا جو صبح یومنہ نے ناشتے کے ساتھ بھیجا تھا اسے جیب سے نکال کر میں نے یومنہ کی طرف بڑھا دیا اور وہ ایک دم سے رک کر جیسے سراسیمہ سی ہو کر مجھے تکنے لگی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ چچا کا ایسا رویہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ اسے اس حوالے سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں' پھر اس کا ذہن بٹانے کے لیے میں نے ایک سوال کر دیا کہ وہ جاگنگ والی یومنہ اور اس گاؤں کا ماحول کوئی میل نہیں کھاتا' جسے سن کر وہ مدھم سا قہقہہ لگاتی ہوئی بولی کہ یہاں حویلی کے اس حصے میں کسی غیر مرد کو آنے کی اجازت نہیں اور حویلی کے سامنے بنے لمبے ٹریک پر وہ بچپن سے ہی جوگنگ کرتی چلی آ رہی ہے وہ اس حصے میں آزادی سے جو چاہے کریں کھیلیں کودیں یا جوگنگ کریں۔ اس کی بات سن کر میں سوچ رہا تھا کہ وہ بالکل صحیح کہہ رہی تھی۔ عورت جتنی آزاد گھر کی چار دیواری میں ہوتی ہے وہ اسے باہر کی دنیا کی نام نہاد آزادی میں نہیں مل سکتی۔

تھوڑی دیر میں ہی چچی چائے لے آئی تو پھر چائے کے بعد میں نے جوان سے اجازت چاہی تو وہ مجھے آج کا دن بھی رک جانے کو کہتی رہیں اور میں نے جواب میں انہیں شہر آنے کی دعوت دے دی۔ پھر ان کی دعائیں لیتے ہوئے میں وہاں سے واپسی کے لیے چل پڑا۔

بڑے ابا کو میں نے گزری رات میں ہی ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا کہ کیسے ٹرین کے چھوٹ جانے کی وجہ سے اب میں خود یومنہ کو گاؤں چھوڑنے چلا آیا ہوں انہیں میری یہ بات سن کر خوشی ہوئی تھی کیونکہ وہ یومنہ کے تن تنہا لمبے سفر کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ یوں انہیں اب تسلی ہوگئی تھی کہ میں خود یومنہ کو گاؤں چھوڑنے چلا آیا تھا۔ میرے گھر پہنچتے ہی بڑے ابا مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور بڑی الفت سے اپنے صاحبزادے مرزا عالم اور گھر کے دیگر ایک ایک فرد کا نام لے کر ان سے متعلق پوچھتے رہے۔ میں نے انہیں چچا مرزا کے میرے ساتھ رکھے سرد رویے کے بارے میں کچھ نہ بتایا بلکہ انہیں کہا کہ وہ تو بھی سے ملنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ گاؤں پہنچ کر وہ کاموں میں ایسے پھنسے ہیں کہ انہیں مہلت ہی نہیں ملتی جو وہ آ کر بڑے ابا سے مل ہی لیں اور فرزند اور دلدار تو میرے ساتھ ہی آنا چاہتے تھے کہ انہیں بڑے ابا سے ملنے کی اس قدر خواہش تھی۔ بڑے ابا میری باتیں سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ خونی رشتوں کی تڑپ سے ان کی آنکھیں چھلک پڑیں پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ یومنہ کب تک واپس لوٹے گی۔ میں نے انہیں بتایا کہ اسے یونیورسٹی کی طرف سے فقط ایک ہفتہ کی ہی چھٹی ملی ہے یوں وہ ایک ہفتہ گاؤں میں گزار کر واپس آجائے گی پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے کو کہنے لگے اور میں ان کی اجازت سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ چچا مرزا عالم کے تلخ رویے کو ان سے چھپا کر میں نے اچھا ہی کیا۔ اگرچہ میری کہی باتوں میں سچائی نہ تھی لیکن ایسا جھوٹ جس سے آپس کے رشتوں میں وقتی پیدا ہو جانے والی دوریاں مٹتی ہوں بولنے میں مجھے کوئی حرج محسوس نہ ہوا بلکہ میں سوچنے لگا کہ ہوسکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چچا کے رویے میں واقعی تبدیلی آجائے اور جیسے آج بڑے ابا انہیں معاف کیے بیٹھے ہیں تو وہ بھی کسی روز بھی پرانی رنجشیں بھلا کر بڑے ابا کے پاس چلے آئیں اور یوں رشتوں کی پہلی سی بہاریں پھر سے لوٹ آئیں۔ پہلی سی بہاروں سے مجھے ایک دم خیال آیا کہ مجھے چچا صفدر کی طرف گئے ہوئے بھی کافی دن بیت چکے تھے اور وہ بھی اتنے خوددار تھے کہ میرے بھی دیر کر دینے کے باوجود بھی انہوں نے مجھے فون کر کے بھی یاددہانی تک نہ کروائی تھی۔ پچھلے کئی برسوں سے ان کے خاندان کی کفالت کا ذمہ میں اپنے سر لیے ہوئے تھا۔ ایسا میں کوئی ثواب کمانے کی غرض سے تو نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ بھی میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے کر رہا تھا۔

مجھے یاد آ رہا تھا اس روز میں اپنے کسی کام کی غرض سے گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب بھابی غصے کے عالم میں مجھے تیزی سے گھر میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ میں تیزی سے اپنی گاڑی سے نکل کر بھابی کی جانب بڑھا۔ وہ اپنی گاڑی پر گئی تھیں اور اب بنا گاڑی کے گھبرائی ہوئی غصے کے عالم میں واپس آ رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان کے ساتھ باہر کوئی مسئلہ پیش آیا ہوگا اور میرے خیال کے بالکل عین مطابق جب وہ میرے قریب پہنچیں تو مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرائی ہوئی مجھے بتانے لگیں کہ باہر کسی اجنبی شخص نے ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہوئے کچھ

نازیبا الفاظ بھی کہے ہیں وہ اپنی گاڑی اس کی گاڑی کی سامنے ہی چھوڑ کر آ گئی تھیں اور یہ سارا معاملہ گھر کے خاص دروازے کے سامنے ہی پیش آیا تھا۔ بھابی نے جس انداز میں مجھے یہ سب بتایا تھا' میں سنتے ہی جیسے اپنے آپے میں نہ رہا ان کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے کر میں نے جو باہر کی جانب چند قدم بڑھائے تو رک کر پلٹا اور کچھ سوچ کر اپنے کمرے کی جانب دوڑا اور پھر جو میں کمرے سے باہر آیا تو میرے ہاتھ میں ریوالور تھا' گھر کے خاص دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی وہ مجھے بھابی کی گاڑی کے پیچھے موجود اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دکھائی دیا۔ اس نے بھی مجھے اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً باہر نکلا اتنے میں' میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ بات کرنے کے لیے بولتا اس سے پہلے ہی میں نے ریوالور اس کی ٹانگ پر رکھ کر فائر کر دیا اور اسے وہیں تڑپتا چھوڑ کر میں نے بھابی کی گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی پورچ میں لے جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ جیسے میرے لیے یہ عام سی بات تھی۔

اسے سڑک پر بے ہوش پڑا دیکھ کر کسی راہ چلتے شخص کو اس پر رحم آیا تو اس نے اسے اسپتال پہنچا دیا اس کا نام صفدر تھا۔ وہ کسی ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور اس وقت وہ ڈاکٹر صاحب کے بچوں کو اسکول سے لینے جا رہا تھا۔ صفدر کے ہوش میں آنے کے بعد پولیس نے صفدر کا جو بیان لیا تو میرے خلاف ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ درج کروا دیا۔ مجھے گھر آ کر گرفتار کرنے سے پہلے ہی پولیس کا ابا سے رابطہ ہو گیا تھا۔ ابا اس وقت ایم این اے تھے اور جب انہیں اطلاع ہوئی تو وہ خود پولیس اسٹیشن پہنچ گئے تھے اور میں اپنے فارم ہاؤس پر عیاشیوں میں مگن تھا۔ جب ابا ڈاکٹر صاحب سے ملے تو ان سے صفدر کی حالت کے بارے میں دریافت کیا۔ جس پر انہوں نے شدید غصے اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ابا کو بتایا کہ گولی اس قدر قریب سے ٹانگ کو لگی تھی کہ جس سے ہڈی کو شدید نقصان پہنچا تھا ہو سکتا ہے' صفدر کی ٹانگ ہی کاٹنا پڑ جائے۔ ابا نے ڈاکٹر صاحب جن کے ہاں صفدر ملازم تھا اور جنہوں نے صفدر کی طرف سے مجھ پر مقدمہ درج کروایا تھا ان سے صفدر کی مالی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اور یہاں شہر میں وہ کسی جگہ کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھا۔ ابا نے ڈاکٹر صاحب کو سمجھایا کہ ان کے ڈرائیور نے بھی ان کی بہو کے ساتھ کس طرح سے تلخ کلامی کی لیکن جو بھی ہوا بہت برا ہوا۔ اب بہتر یہی ہے کہ معاملہ مل بیٹھ کر ہی سلجھا لیا جائے۔ ہم صفدر کے علاج کے سارے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ مقدمہ واپس لے لیں' لیکن ڈاکٹر صاحب کسی صورت بھی مقدمہ واپس لینے کو تیار نہ تھے پھر شاید پولیس کے رویے سے تنگ آ کر یا ابا کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے چند ہی روز بعد ابا کی بات مان لی لیکن پھر وہی ہوا جس کا ڈاکٹر صاحب کو خدشہ تھا' صفدر کی ایک ٹانگ کاٹنا پڑی اور وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنے دو معصوم بچوں کا واحد کفیل تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور صفدر اسپتال سے گھر منتقل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں ڈرائیور کی جو نوکری وہ کر رہا تھا وہ تو کب کی چھوٹ گئی اب ڈاکٹر صاحب اور میرے ابا جنہوں نے صفدر کے علاج کے اخراجات برداشت کرنے کی ہامی بھری تھی اب صفدر کے اسپتال سے گھر منتقل ہوتے ہی گویا' وہ اس کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو گئے تھے چاہیے تو یہ تھا کہ صفدر کی معذوری کے بعد اب وہ مستقل طور پر اس کی مالی امداد کا ذمہ اٹھا لیتے لیکن جب مقدمہ ختم ہو گیا'

صفدر کا چل رہا ڈاکٹری علاج بھی مکمل ہو گیا تو پھر جیسے انہوں نے صفدر سے اپنا پیچھا چھڑا لیا اور جب کافی عرصے بعد مجھے صفدر کا خیال آیا تو بڑی تگ ودو کے بعد اسے ڈھونڈتا ہوا میں اس تک پہنچا تھا۔ اس کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرتی تھی اور خود صفدر بھی کوئی نہ کوئی ایسا چھوٹا موٹا کام تلاش کر لیا کرتا تھا جو وہ وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے آسانی سے کر لیا کرتا تھا لیکن اس ساری کسمپرسی کے باوجود اس نے اپنے بچوں کو متاثر نہ ہونے دیا تھا۔ اس کے دونوں بچے اسکول جاتے تھے اور جب میں اسے ڈھونڈتا اس تک پہنچا تو مجھے اس کی اس بات نے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں نے اس سے مل کر اپنے کیے کی معافی طلب کی تو اس نے مجھے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ معاف کر دینے والا بدلہ لینے والے سے افضل ہوتا ہے۔ آج اسی افضل انسان کے ہاں جانے سے پہلے میں نے ایک شاپنگ سینٹر پر رک کر اس کے بیوی بچوں کے لیے تحفے تحائف اور کھانے پینے کی چند اشیاء خریدیں اور اس کے گھر جا پہنچا بچے میری آمد پر خوشی سے شور مچاتے ہوئے میرے اردگرد آ کھڑے ہوئے اور میں ان کے لیے خریدے تحفے تحائف انہیں دینے لگا۔ یونہی اکثر جب میں صفدر کی طرف آتا تو بچے مجھے اپنے ہوم ورک کی کاپیاں بھی دکھاتے اور میں انہیں شاباش دیتا کہ وہ یونہی من لگا کر تعلیم حاصل کرتے رہیں۔ صفدر سے اجازت لے کر میں اس کے گھر سے نکلا تو یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ اگر اس روز میں غصے کے عالم میں صفدر پر گولی نہ چلاتا تو وہ آج اپنی ٹانگ سے محروم بھی نہ ہوا ہوتا پھر اس کا جرم کیا تھا بات تو فقط اتنی ہی تھی کہ بھابی کان سے فون لگائے کسی سے باتیں کیے جا رہی تھیں اور صفدر کی جو گاڑی پیچھے آ رہی تھی اسے گزرنے کے لیے راستہ چاہیے تھا۔

اسے ڈاکٹر صاحب کے بچوں کو اسکول سے لینا تھا اور وہ بھی جلدی میں تھا۔ بھابی نے گھر کے سامنے گاڑی سڑک کے بیچ ہی روک دی اور جب صفدر اپنی گاڑی سے نکل کر ان سے اپنی گاڑی سامنے سے ہٹانے کو کہنے لگا تو وہ غصے کے عالم میں ایک دم سے بھڑک اٹھیں اور اسے دھمکیاں دینے لگیں کہ تم مجھے جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں۔ صفدر راستہ مانگنے کے لیے فقط ہارن بجاتا رہا تھا اور اس بات کا وہ برا مان گئی تھیں۔ صفدر دیکھ رہا تھا کہ بھابی فون پر باتیں کرتی ہوئی جا رہی ہیں اس نے بھی انہیں سنا دیں کہ اگر فون سننا ہی ہے بی بی جی تو آپ گاڑی ایک طرف روک لیں اور پھر چاہیں تو جتنی مرضی باتیں کرتی رہیں۔ صفدر کی ایسی باتیں سنتے ہی بھابی غصے سے بے قابو ہو کر گاڑی وہیں سڑک کے وسط میں ہی چھوڑ کر اندر چلی آئی تھیں اور جو باتیں انہوں نے مجھے بتائی تھیں ان میں کتنی صداقت تھی یہ مجھے صفدر کی باتیں سن کر بعد میں اندازہ ہوا تھا لیکن اب صفدر کی ایک ٹانگ اسے واپس تو نہیں مل سکتی تھی، دولت پیسے رتبے کے گھمنڈ میں ایسی کتنی ہی بیگمات ہوتی ہوں گی، ایسے کتنے ہی ظالم ہوتے ہوں گے جو بنا سوچے سمجھے بنا تصدیق کیے کہ آخر غلطی کس کی ہے، کتنے ہی لوگوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالتے ہوں گے۔ ان کا اثر و رسوخ تو انہیں قانون کی گرفت سے بھی بچا لیتا ہو گا لیکن وہ یہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ ان کے ایسے قبیح فعل سے کتنے چولہے سرد پڑ جائیں گے کتنے بچے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے، نہیں تو اللہ تو یہ سب دیکھ ہی رہا ہے۔ دولت، پیسہ، رتبہ بھی اسی نے دے رکھا ہے اور وہی جب چاہے تو انسان کو اپنی ان نعمتوں سے محروم کر دے۔ میں ایسا ہی سوچتا گھر پہنچا تو پورچ میں آج ایک نئی گاڑی کھڑی دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ کوئی

مہمان آئے ہوں گے پھر میرے اپنی گاڑی سے اتر کر اسے لاک کرتے ہی مجھے رومی میاں اپنی جانب دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیئے اور دور لان تک جو میں نے نگاہ دوڑائی تو وہاں واقعی گھر کے اپنے افراد کے علاوہ مجھے چند اجنبی چہرے بھی دکھائی دیئے رومی میاں نے میرے پاس پہنچتے ہی مجھے بتایا کہ آج یومنہ آنٹی واپس آ گئی ہیں اور ماں مجھے اس طرف بلا رہی ہیں میں رومی میاں کے ساتھ ساتھ ہی چلتا ہوا ان کے قریب پہنچا تو تعارف سے مجھے معلوم پڑا کہ یہ یومنہ کی والدہ کی طرف سے کوئی دور کے انکل آنٹی تھے جو کہ یہیں شہر میں عرصہ دراز سے مقیم تھے اور چند روز پہلے وہ گاؤں جو رشتہ داروں سے ملنے گئے تھے تو اب واپسی پر چونکہ یومنہ کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ ان کے ہمراہ ہی چلی آئی تھی۔ مہمان کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے اور پھر ماں بھی اٹھ کر اندر چلی گئی تو اب فقط یومنہ ہی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے یومنہ سے گھر کے سبھی افراد کا حال دریافت کیا اور پھر میں بھی وہاں سے اٹھنے ہی والا تھا جب یومنہ کی بات سن کر میں دوبارہ واپس بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتی تھی کہ اس روز بابا رب نواز سے ہوئی پہلی ملاقات میں انہوں نے میرے کانوں کے قریب دھیرے سے ایسا کیا کہا کہ پھر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا' یومنہ کی بات سن کر میں اسے بتانا ہی چاہتا تھا کہ جب عصر کی اذان شروع ہو گئی۔ یومنہ مجھے اٹھتا دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اب اذان کی آواز سن کر میں وہاں رکنے والا نہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور میں نے اسے اشارتاً ہی جواب دیا کہ میں اسے اس سوال کا جواب بعد میں دوں گا اور میں وہیں سے مسجد چلا گیا۔

مسجد سے جب میں نماز ادا کر کے گھر پہنچا تو مجھے بڑے ابا نے اپنے کمرے میں بلایا اور وہ کہنے لگے کہ ان کی تبلیغی جماعت کسی دوسرے شہر جا رہی ہے اور وہ اپنے ہمراہ مجھے بھی لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے جو خوشی خوشی ہامی بھر لی تو ہم مغرب کے بعد ہی اپنا ساز و سامان اٹھائے گھر سے چل پڑے تھے۔ ہمیں تین روز تک اس شہر میں ٹھہرنا تھا اور بڑے ابا اکثر مجھے ایسے تبلیغی دوروں پر اپنے ہمراہ لے جایا کرتے تھے اور میرا من بھی اب ایسے تبلیغی دوروں میں خوب لگتا تھا۔ اپنے شہر سے باہر دوسرے شہر میں ہمیں دو تین دن گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور جب ہم دادا پوتا واپس گھر لوٹ آئے تھے' لیکن گھر پہنچتے ہی ہمیں ماں سے جو بات پتہ چلی اسے سن کر بڑے ابا کے ساتھ ساتھ مجھے بھی تعجب ہوا۔ ماں نے بتایا کہ یومنہ کے جو انکل اور آنٹی اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے وہ آج صبح دوبارہ آئے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ان کی کوئی اولاد تو ہے نہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ یومنہ اب انہی کے پاس رہنے آ جائے اور باقی تعلیم وہ وہیں ان کے پاس رہ کر مکمل کر لے اور اس سلسلے میں وہ یومنہ کے والد اور والدہ سے بھی بات کر چکے ہیں۔ بڑے ابا نے جو یہ بات سنی تو وہ بہت خفا ہوئے۔ میں ان کے پاس ہی کھڑا تھا' انہوں نے اسی وقت مجھے کہا کہ میں ان کی فون پر چچا مرزا سے بات کرواؤں لیکن میں نے ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے انہیں اس وقت روک دیا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ صحیح تھے۔ بھلا اپنے سگے خونی رشتوں کو چھوڑ کر چچا اپنی صاحبزادی کو دور کے جاننے والوں کے ہاں کیوں بھیج رہے تھے لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ ایسا سب میری وجہ سے ہو رہا تھا' اس روز جو میں یومنہ کو گھر چھوڑنے گیا تھا تو اس بات کو لے کر چچا خفا ہو گئے تھے۔ چچا کو میرا یومنہ کو گھر چھوڑ کر آنا ناپسند نہ آیا تھا اور یہ سب میری اسی خطا کی وجہ سے ہو رہا تھا لیکن پھر پاس ہی کھڑی ماں کی بات سن کر میں ششدر ہو

کرہ گیا تھا۔ جیسے مجھے اپنی سماعت پر ہی یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ بڑے ابا سے کہہ رہی تھیں کہ انہیں لگتا ہے کہ مرزا بھائی صاحب یومنہ کے لیے ہمارے طٰہٰ کو پسند کررہے ہیں اس روز طٰہٰ یومنہ کو گھر تک چھوڑنے بھی تو گیا تھا اور پھر بھائی صاحب اور بھابی نے طٰہٰ کو وہیں ٹھہرالیا تھا یوں وہ چاہتے ہوں گے کہ یومنہ اس گھر میں جہاں طٰہٰ بھی موجود ہے مزید نہ ٹھہرے۔"

ماں کی ایسی سوچ جان کر میں دنگ رہ گیا تو اب بڑے ابا کی باتیں سن کر میں ایک بار پھر سے حیران ہورہا تھا۔ وہ ماں سے کہہ رہے تھے کہ انہیں یومنہ بیٹی بہت پسند ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ مرزا سے بات کرکے وہ طٰہٰ کے لیے اس کا ہاتھ مانگ لیں یوں ماں نے بھی بڑے ابا کی بات سن کر خوشی خوشی ہامی بھرلی اور میں سوچ رہا تھا کہ آمنہ کم پڑھی لکھی تھی اور بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اب ان کا بیٹا معمولی پڑھا لکھا تھا اور یومنہ ماسٹر کررہی تھی اور خوب صورت بھی تھی شاید ماں کو مجھ میں کوئی خامی دکھائی ہی نہ دیتی تھی بھلا میرے جیسے شخص سے کوئی اپنی بیٹی کا رشتہ کیونکر جوڑے گا۔

اگلے ہی روز یومنہ کے آنٹی اور انکل اسے لینے آگئے تھے میں اپنے کمرے میں ہی تھا جب ماں نے بابا عبدالقادر کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ یومنہ جارہی ہے۔ میں باہر پہنچ کر اس سے مل لوں۔ یہ سنتے ہی مجھے یاد آیا کہ ابھی یومنہ کے پوچھے سوال کا جواب بھی تو مجھے دینا تھا میں نے اسی وقت قلم اٹھایا اور جواب تحریر کرکے رقعہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یومنہ چند ہی دنوں میں جیسے ہمارے گھر کا ایک اہم فرد بن گئی تھی اور اب یوں اچانک اس کے چلے جانے کی خبر نے جیسے سبھی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اداس کردیا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور جو پورچ میں پہنچا تو آنٹی کے ساتھ ہی انہی کی طرح ایک اور لڑکی عبایا پہنے کھڑی تھی میں نے اسے بھی سلام کیا اور اب میری نگاہیں یومنہ کو ڈھونڈ رہی تھیں جو مجھے کہیں دکھائی نہ دی میں نے سوچا ہوسکتا ہے وہ ابھی کمرے میں ہی ہو اپنا سامان پیک کررہی ہو ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب میرے عقب سے مجھے یومنہ کی آواز سنائی دی میں نے پلٹ کر جو دیکھا تو جیسے میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوگئیں۔ آنٹی کے ساتھ عبایا پہنے کوئی اور نہیں بلکہ یومنہ ہی کھڑی تھی۔ اس نے آج ہمارے گھر سے جاتے ہوئے میرا تحفتاً دیا ہوا عبایا پہن رکھا تھا۔ میں جو ابھی تک حیرت زدہ سا کھڑا تھا تو وہ مجھی سے مخاطب تھی۔ "آپ پوچھیں گے نہیں طٰہٰ آج اس گھر سے جاتے ہوئے میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا کیوں پہن رکھا ہے۔" اس کی بات کا جواب میں نے فقط اپنے چہرے کے تاثرات سے دیا تو وہ بولنے لگی۔ "طٰہٰ میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ مجھے اس گھر میں آکر کیا حاصل ہوا اور میں جو اس گھر میں فقط چند روز ہی گزار کر یہاں سے جارہی ہوں تو میں اس گھر سے کیا لے کر جارہی ہوں۔ میں آپ کے آنگن سے شرم وحیا کا حجاب لے کر جارہی ہوں میں نے آپ سے مل کر زندگی کا اصل مقصد پالیا ہے۔" اس کی باتوں سے جہاں مجھے بے حد مسرت ہوئی وہیں میں حیرت زدہ سا کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی یومنہ ہے۔ عین اسی وقت ماں ہم دونوں کو ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر ہمارے پاس آئیں انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور پھر یومنہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"ہم بہت جلد تمہیں مانگنے گاؤں آئیں گے۔" ماں نے جو ایک دم سے یہ بات یومنہ سے کہہ ڈالی جو ماں کو یومنہ سے نہیں کہنا چاہیے تھی تو اب میں جیسے وہاں اک لمحہ بھی رکنا نہیں چاہتا تھا کہ جانے ماں کی یہ

بات سن کر یومنہ میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ اسی مقصد سے میں نے ابھی چند قدم آگے بڑھائے ہی تھے جب مجھے یومنہ کی آواز اپنے عقب سے آتی سنائی دی۔ ''امی مجھے آپ کے آنے کا انتظار رہے گا۔'' میں یہ سن کر جیسے وہیں ٹھہر گیا لیکن مجھ میں پلٹ کر یومنہ اور ماں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی مجھے رومی میاں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے اور رقعہ ابھی تک میری جیب میں ہی پڑا تھا۔ مجھے خود تو ہمت نہیں ہوئی کہ میں وہ رقعہ یومنہ کو دیتا وہاں اس وقت گھر کے سبھی افراد موجود تھے اور یہ کام رومی میاں ہی کر سکتے تھے' پھر مجھے رومی میاں مل ہی گئے مجھ پر جوان کی نگاہ پڑی تو میں نے انہیں دور سے ہی اشارہ کیا' میرا اشارہ پاتے ہی وہ جھٹ سے بھاگتے ہوئے میرے پاس چلے آئے۔ میں نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ رقعہ ان کے ہاتھ میں دیا اور ان کے کان کے ذرا قریب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ یہ رقعہ اپنی یومنہ آنٹی کو دے آئیں اور چند لمحے مزید وہاں رک کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اب اپنے کمرے میں پہنچ کر میں یہی سوچ رہا تھا کہ یارب یہ کیا ماجرا ہے' ماں کی بات تو مجھے سمجھ آتی تھی ان کے ممتا بھرے جذبات کی اوٹ میں میرا ہر عیب جیسے چھپ گیا تھا' انہیں تو مجھ میں کوئی عیب یا کھوٹ دکھائی نہ دیتا تھا' لیکن یہ یومنہ کو کیا ہوا جو وہ بھی مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہوگئی تھی اور جب ماں نے اسے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اپنے طٰہ کے لیے گاؤں جا کر اس کا ہاتھ مانگیں گی تو یومنہ نے بھی جیسے جھٹ سے اقرار میں کہہ دیا کہ اسے بھی ان لمحوں کا انتظار رہے گا پھر مجھے چچا مرزا کا خیال آنے لگا جنہیں فقط میرا یومنہ کو ان کے ہاں چھوڑ کر آنا ہی ناگوار گزرا تھا۔

پھر میں سوچنے لگا کہ جب بڑے ابا ماں اور ابا کے ہمراہ گاؤں جا کر چچا مرزا سے میرے لیے یومنہ کا رشتہ مانگیں گے تو ان کا جواب کیا ہوگا؟ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس رشتے کو قبول کریں گے اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تو ماں اور ابا تو شاید اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیں لیکن بڑے ابا کے جذبات کو میں اچھے سے سمجھتا تھا۔ چچا مرزا کے انکار پر ان کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی یہ سوچ کر میں خود کو ہی کوسنے دینے لگا تھا اگر میں نے اس روز گاؤں سے لوٹنے کے بعد بڑے ابا کو بھی کچھ سچ سچ بتا دیا ہوتا تو شاید وہ یومنہ اور میرے رشتے کی بات ہی شروع نہ کرتے۔ یا کم سے کم انہیں اندازہ ہوتا کہ چچا کے دل میں میرے لیے کتنی جگہ ہے۔ ایسے ہی خیالات کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں میں پھر ایسا بھی سوچنے لگا کہ ہوسکتا ہے' ماں اور ابا کے ساتھ ساتھ بڑے ابا بھی جو جا رہے ہیں تو بڑے ابا کی بات کو چچا مرزا رد نہ کریں اور وہ اس رشتے کو قبول کرلیں' یہ خیال ذہن میں آتے ہی نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا تھا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا۔ ماں اور ابا کے ساتھ ساتھ بڑے ابا کو دیکھ کر چچا کا دل موم ہو جائے گا اور یوں وہ بڑے ابا کی بات مان لیں گے اور برسوں سے رشتوں میں جو خلاء سا چلا آرہا تھا وہ خلا میرے اور یومنہ کے رشتہ کے طے ہو جانے سے مٹ جائے اور بڑے ابا جو برسوں سے اپنے خاندان کے ایک ہونے کی دعائیں کرتے چلے آرہے تھے' یوں ان کا وہ خواب بھی پورا ہو جائے گا اور مجھ میں جو اس رشتے سے انکار کرنے کی ہمت نہ تھی تو اس کے پیچھے بھی یہی وجہ تھی ورنہ میں خود کو یومنہ جیسی لڑکی کے قابل کب سمجھتا تھا۔

یومنہ کے ہمارے گھر سے جانے کے چند روز بعد ہی گھر کے سبھی لوگ چچا مرزا کے پاس گاؤں جا پہنچے اور

میں نے ان کے جانے کے بعد جائے نماز سنبھال لی۔ میں جائے نماز پر بیٹھا دعائیں کرتا رہا کہ یارب چچا مرزا اس رشتے کو قبول کرلیں اور ہمارے خاندانوں میں چل رہی تمام دیرینہ رنجشیں یونہی مٹ جائیں۔ سبھی پھر سے ہر خوشی اور غم میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ شریک ہوں۔ شام کو مغرب کے بعد بھی میں اللہ سے ایسی ہی دعائیں مانگ رہا تھا جب بابا عبدالقادر نے میرے کمرے میں آکر مجھے بتایا کہ سبھی گھر والے لوٹ آئے ہیں۔ میں بے تابی سے اٹھ کر بابا عبدالقادر کے ساتھ ساتھ ہی جو پورچ میں پہنچا تو انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ چچا مرزا نے رشتے سے انکار کردیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچا تو کسی نے مجھ سے بات تک نہ کی' بھائی اور بھابی یونہی میرے پاس سے گزر گئے۔ ماں اور ابا اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے اور بڑے ابا کو جو میں نے اپنے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھا تو جیسے مجھے ہمت ہی نہ پڑی کہ ان سے آگے بڑھ کر پوچھوں کہ چچا نے کیا جواب دیا۔ یہ تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ چچا نے رشتے سے انکار کردیا ہے' لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہاں گاؤں میں چچا اور بڑے ابا کے درمیان آخر کو کیا باتیں ہوئیں فی الوقت میں نے بڑے ابا کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کردیا تھا اور پھر عشاء کی نماز کے بعد جو میں ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے بستر پر لیٹے آرام کررہے تھے۔ میں دھیرے سے ان کے پاس پہنچا اور میں نے جیسے ہی ان کے پیر دابنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مجھے احساس ہوا کہ ان کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ میں جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا' ان کی پیشانی پر جو ہاتھ رکھا تو انہیں خاصا تیز بخار تھا۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں کہنے لگے کہ طٰہٰ بیٹا تمہارے چچا نے رشتے سے انکار کردیا' میں نے جو بڑے ابا کی یہ بات سنی تو جھٹ سے جواب دیا۔

''تو پھر کیا ہوا' بڑے ابا جو انکار کردیا۔'' مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ اگر چچا مرزا نے رشتے سے انکار کردیا تو اس بات کا بڑے ابا کو شدید صدمہ ہوگا۔ اسی لیے بڑے ابا کی بات سن کر میں نے انہیں ایسا جواب دیا تھا تاکہ وہ اس بات کو کچھ خاص اہمیت نہ دیں پھر وقت ضائع کیے بغیر میں نے فوراً پہلے ڈاکٹر کو کال کی اور پھر ان کا سر دابنے بیٹھ گیا۔ جب وہ دوبارہ بولنے لگے تھے۔

''طٰہٰ بیٹا! مرزا نے مجھے انکار کردیا' مجھے کہنے لگا اگر میں اس بات کو بھول جاؤں کہ میرے بھائی خورشید عالم نے میری بیٹی کا رشتہ لینے سے انکار کردیا تھا اور اس بات کو بھی بھلا دوں کہ طٰہٰ کے ہاتھوں قتل بھی ہوچکا ہے' جس کی اسے معافی مل گئی تھی تو میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ طٰہٰ کو کبھی بھی پاگل پن کے دورے پڑنے لگتے ہیں' میں اپنی بیٹی کا رشتہ ایک ایسے شخص سے کیوں جوڑ دوں جو خود کو سنبھالنے کے قابل نہیں۔ بڑے ابا کی زبانی چچا کی یہ باتیں سن کر مجھے بھی شدید دھچکا پہنچا اور میں سوچنے لگا کہ بڑے ابا کو اس قدر شدید بخار بھی اسی لیے ہوا تھا۔ انہوں نے چچا کی باتوں کو دل پر لیا تھا اسی لیے میں نے انہیں چپ ہونے کو نہ کہا' میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل کی ساری باتیں کہہ دیں تاکہ ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہوسکے۔ وہ پھر سے بولے۔ ''طٰہٰ بیٹا میں نے مرزا کو سمجھایا تھا کہ طٰہٰ اب بالکل ٹھیک ہے' اسے عرصہ ہوا اب کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور وہ میرے ساتھ کام بھی سنبھالنے لگا ہے۔'' بڑے ابا ایسے ہی بول رہے تھے جب ڈاکٹر بھی آپہنچا۔ بابا عبدالقادر نے ماں اور ابا کو بھی جا کر بڑے ابا کی طبیعت کے حوالے سے آگاہ کردیا تھا' اور اب بھائی

بھابی سبھی ان کے گرد جمع تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ذرا سا بلڈ پریشر اور بخار ہے وہ انجکشن لگا دیتے ہیں جس سے انہیں نیند آئے گی اور آرام ملنے سے یہ اچھے ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر کے انجکشن لگا کر چلے جانے کے بعد جب بڑے ابا نے انجکشن کے اثر سے آنکھیں بند کر لیں تو ماں، ابا، بھائی اور بھابی کمرے سے چلے گئے اور میں پاس پڑی کرسی پر بیٹھا انہی کے پاس ٹھہر گیا کہ کیا پتہ رات کے کسی پہر ان کی آنکھ کھلے تو انہیں جو کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو میرے ان کے پاس موجود ہونے سے انہیں کوئی پریشانی پیش نہ آئے۔

بڑے ابا کے سو جانے کے بعد میں نے بھی وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں تو آنکھیں بند کرتے ہی مجھے بھی اونگھ آ گئی لیکن مجھے رات کے آخری پہر سے پہلے جاگ کر جو تہجد کے نوافل پڑھنے کی عادت تھی تو مقررہ وقت سے پہلے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اب وضو کرنے کے لیے جو میں اٹھا تو میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کمرے میں میری مصروفیت سے کوئی ایسی آواز پیدا نہ ہو جس سے بڑے ابا کی آنکھ کھل جائے اور ان کے آرام میں خلل پڑے۔ نوافل کے بعد میں رب سوہنے سے بڑے ابا کی صحت اور ان کی درازی عمری کی دعائیں کرتا رہا اور اپنا سر سجدے میں جھکا دیا۔ فجر کی اذانیں شروع ہوئیں اور جو اذان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے ایک طویل سجدے سے اپنا سر اٹھایا۔ بڑے ابا پر جو نگاہ پڑی تو اب وہ جاگ رہے تھے۔ گھر سے قریبی مسجد میں موذن نے فجر کی اذان شروع کی تو میں وہیں جائے نماز پر بیٹھا اذان سن کر اس کا جواب دینے لگا۔ اذان ختم ہوئی تو دعا کر کے میں بڑے ابا کی طرف بڑھا۔

''طٰہٰ بیٹا! میں اب ٹھیک ہوں، مجھے ذرا اٹھنے میں مدد کرو۔'' وہ میرے قریب پہنچتے ہی بولے ان کی بات سن کر میں نے اپنا ایک بازو ان کے کاندھوں کے گرد حائل کرتے ہوئے انہیں سہارا دیا تو وہ اٹھ کر وضو کرنے چلے گئے۔ وضو کرنے کے بعد وہ وہیں فرش پر بچھے جائے نماز پر کھڑے ہوتے ہوئے بولے کہ وہ آج مسجد نہیں جا پائیں گے وہ گھر ہی نماز ادا کریں گے ان کی بات سن کر میں مسجد میں نماز ادا کرنے چلا گیا۔ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بعد میں اشراق کی نماز ادا کر کے ہی مسجد سے لوٹتا تھا، لیکن آج بڑے ابا کی جو طبیعت بہتر نہ تھی تو میں فجر ہی ادا کر کے گھر کی طرف بڑھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں بڑے ابا کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ دروازہ کھولتے ہی اندر داخل ہو کر جو میری ان پر نظر پڑی تو جیسے میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی، وہ اوندھے منہ جائے نماز پر پڑے تھے۔

''بڑے ابا...... بڑے ابا آپ ٹھیک تو ہیں۔'' میں انہیں پکارتا ہوا ان کی طرف جھکا، انہیں سیدھا کیا، ان کی آنکھیں بڑی تیزی سے جھپک رہی تھیں اور لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ میں نے جھٹ سے انہیں اٹھا کر بستر پر لٹایا اور اپنے کمرے کی جانب گاڑی کی چابی لینے دوڑا، باہر ہی مجھے بابا عبدالقادر مل گئے، میں نے انہیں کہا کہ وہ ماں اور ابا کو جلدی سے جگائیں وہ میری حالت کو دیکھتے ہوئے فوراً انہیں جگانے چلے گئے اور میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں سے گاڑی کی چابی لے کر میں واپس بڑے ابا کے کمرے میں پہنچا تو سبھی ان کے پاس کمرے میں موجود تھے، ابا اور بھائی نے بڑے ابا کو اٹھایا اور پھر مجھ سمیت سبھی لوگ ان کے

پیچھے پیچھے باہر کی جانب دوڑے' میرے پاس اپنی گاڑی کی چابی تھی' میں نے جھٹ سے آگے بڑھ کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا تو پھر انہیں پچھلی سیٹ پر لٹا دیا' مصطفیٰ بھائی نے ساتھ بیٹھتے ہوئے ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تو ابا میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ راستہ بھر سڑکیں ویران تھیں یہی وجہ تھی کہ میں نے پوری رفتار سے گاڑی دوڑائی اور پھر اسپتال پہنچتے ہی ہم اسٹریچر پر ڈال کر بڑے ابا کو ایمرجنسی میں لے گئے۔ ایمرجنسی میں پہنچ کر میں ایک دو ڈاکٹرز سے الجھ پڑا کہ وہ جلدی سے بڑے ابا کو ٹریٹمنٹ نہیں دے رہے۔ بھائی میری حالت کو سمجھتا تھا اس نے مجھے حوصلہ رکھنے کی تلقین کی' اتنے میں ماں اور بھابی بھی ایمرجنسی پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹرز نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ بڑے ابا کا بلڈ پریشر شوٹ آؤٹ ہوجانے کی وجہ سے ان کی زندگی خطرے میں تھی۔ انہیں فوراً آئی سی یو میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر کی بات سن کر بھی جیسے سکتے میں الگ رہے تھے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو حوصلہ رکھنے کی تلقین بھی کر رہے تھے۔ آئی سی یو سے باہر لگی کرسیوں پر بیٹھے میں نے اپنا سر دیوار سے ٹکائے آنکھیں موند دعائیں کرنی شروع کردی تھیں۔ کئی گھنٹوں تک میں ایسے ہی آنکھیں موندے دعائیں کرتا رہا اور اس وقت آنکھیں کھولیں جب بھائی نے مجھے آکر بتایا کہ اللہ نے تمہاری دعائیں سن لیں۔ طٰہٰ بڑے ابا کو ہوش آگیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔ میں ان سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ جب بھائی نے بتایا کہ ڈاکٹرز نے ابھی کئی گھنٹوں تک ان سے بات چیت کرنے سے منع کر رکھا ہے لیکن میری بے تابی دیکھ کر بھائی مجھے بڑے ابا کے پاس لے گیا' پھر اس نے مجھے ان سے بات کرنے سے روکے رکھا۔

شام تک بڑے ابا آئی سی یو سے الگ کمرے میں منتقل ہوگئے تھے اور پھر اگلے ہی روز ان کی طبیعت ٹھیک ہوجانے پر ڈاکٹرز نے ہمیں انہیں گھر لے جانے کی اجازت دے دی اور ہم انہیں گھر لے آئے تھے۔ اگلے دو روز تک تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہے لیکن تیسرے روز ان کی طبیعت پھر سے بگڑ گئی' درحقیقت انہیں یہ غم شدت سے کھائے جا رہا تھا کہ مرزا نے ایک تو رشتے سے انکار کردیا دوسرا وہ بڑے ابا کی طبیعت بگڑنے پر ان کا حال تک دریافت کرنے نہیں پہنچے تھے۔ بڑے ابا کی روز بروز گرتی حالت کو دیکھ کر پھر ایک روز میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں خود چچا مرزا کے پاس جاؤں اور ان سے درخواست کروں کہ وہ وقتی طور پر ہی سہی بڑے ابا کے پاس آکر ان سے کہہ دیں کہ انہیں اس رشتہ سے کوئی اعتراض نہیں' یہ خیال آتے ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی کو بتائے بغیر چچا کے پاس جہانیاں آباد جاؤں گا اور چچا کے پیر پکڑ کر ان سے التجا کروں گا۔ یوں اگلے ہی روز میں کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر گاؤں چل پڑا اور راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ اگر چچا مرزا میری بات مان کر بڑے ابا کے پاس چل کر وقتی طور پر رشتے کی ہامی بھر لیں تو بڑے ابا اسی خوشی سے صحت یاب ہوجائیں گے پھر یقینی اور بے یقینی جیسی صورت حال سے دوچار میں گاؤں پہنچا اور سیدھا ڈیوڑھی پھلانگ کر حویلی میں داخل ہوگیا۔ مہمان خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں جیسے ہی حویلی کے خاص حصے کی طرف بڑھا دور پنجروں کی لمبی قطار کے پاس مجھے یومنہ کھڑی دکھائی دی۔ وہ ہاتھ میں دانے دنکے والی ٹرے پکڑے پرندوں کو دانہ ڈال رہی تھی اس کی نگاہ جو مجھ پر پڑی تو میں وہی رک گیا اور وہ بھی دانے دنکے والی ٹرے کو وہیں نیچے رکھ کر میری جانب بڑھی۔ یومنہ کے ہمارے گھر سے جانے کے

بعد میرا اس کے ساتھ کوئی کسی قسم کا رابطہ نہ تھا۔ وہ میرے پاس آئی تو آتے ہی اس نے سب سے پہلے مجھ سے بڑے ابا کا حال ہی دریافت کیا۔ میں نے جو اسے بڑے ابا کی روز بروز گرتی صحت کے حوالے سے آگاہ کیا تو وہ بھی میری بات سن کر میری طرح آزردہ دکھائی دینے لگی۔ میں نے اس سے چچا کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ اس وقت کہاں ملیں گے لیکن اسے یہ نہیں بتایا کہ میں ان سے کیوں ملنے آیا ہوں اس نے بیٹھک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس طرف ہیں اور پھر وہ مجھے اس جانب بڑھتا دیکھ کر خود بھی وہاں سے چلی گئی۔ میں بیٹھک میں داخل ہوا۔ چچا اپنے سامنے چند فائلیں پھیلائے ان پر جھکے بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے پاس پہنچ کر انہیں سلام کیا تو وہ مجھے اچانک اپنے سامنے کھڑا پا کر چونک پڑے اور متعجب نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے کی بات اور تھی اب جب میرے گھر والے ان سے میرے رشتے کی بات بھی کر چکے تھے تو انہیں میرا یوں بن بتائے ان کے گھر آنا سخت دوبھر گزرا ان کی خشمگیں نگاہوں کی پروا کیے بغیر میں نے جھک کر فوراً ان کے پیر پکڑ لیے اور ان سے التجا کرنے لگا کہ وہ بڑے ابا کی زندگی بچالیں۔ میری اگلی رشتے والی تجویز سن کر انہوں نے نفرت سے مجھ سے منہ پھیر لیا۔

''جب تمہارے گھر کے لوگوں نے میری بیٹی کا رشتہ لینے سے انکار کردیا تھا تو اس وقت تمہارے بڑے ابا کہاں تھے۔ اس وقت تو انہیں کوئی خیال نہیں آیا کہ میں جو خود چل کر رشتہ لے کر گیا تھا' انکار کے بعد مجھ پر کیا بیتے گی' بس ساری زندگی وہ اپنے لاڈلے خورشید عالم کا ہی بھلا سوچتے رہے۔ مجھے بھی ان کی کوئی پروا نہیں۔'' چچا مجھ سے رخ پھیرے بول رہے تھے لیکن میرے پاس ان کی کہی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا' اتنے میں فرزند اور دلدار بھی آ گئے۔ وہ بھی غصے میں لگ رہے تھے اندر پہنچتے ہی وہ اپنے ابا سے بولے کہ اسے کہیں کہ یہ جتنی جلدی ہوسکے اس گھر سے اس گاؤں سے نکل جائے نہیں تو یہ اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔'' ان کی یہ باتیں سن کر میرے دل کو شدید دھچکا پہنچا پھر میں ایک پل وہاں نہ ٹھہر سکا اور سرعت سے کمرہ چھوڑ کر باہر آ گیا' باہر جا کر میں نے آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ٹھہر کر اک نظر اس جانب دیکھا جہاں میرے آنے پر یومنہ کھڑی پرندوں کو دانہ ڈال رہی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اب بھی پنجرے خالی پڑے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یومنہ نے بڑے ابا کی صحت کے صدقے سارے پنچھیوں کو آزاد کردیا تھا اور دل ہی دل میں یہ دعا کرتے ہوئے کہ یارب یومنہ کے اس صدقے کو قبول کرلے میں اپنی گاڑی تک پہنچا اور پھر بجھے ہوئے مجروح دل کے ساتھ میں نے گاڑی گھر کی جانب بڑھادی۔ راستہ بھر مجھے رہ رہ کر بڑے ابا کا خیال ستاتا رہا' میں جو بڑی آس و امید کے ساتھ چچا کے پاس آیا تھا کہ بڑے ابا کی روز بروز گرتی صحت کا سن کر چچا بے تاب ہوکر میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوجائیں گے لیکن میری سوچ کے برعکس چچا کے بے حس و بے مروت رویے سے میں سخت دلگیر ہوکر لوٹ رہا تھا' راستہ بھر میں کہیں زیادہ دیر کو نہ ٹھہرا کہ جانے گھر بڑے ابا کیسے ہوں گے۔

جب میں اپنے شہر پہنچا تو ابھی عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں اور جب میں اپنے گھر کے بیرونی دروازے کے پاس پہنچا تو وہاں بہت سی گاڑیاں اور موٹر بائیکس دیکھ کر میرا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔ میں نے گاڑی کا ہارن بجایا تو ملازم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا میں نے گاڑی ذرا آگے لے جا کر روک دی تو ملازم نے

مجھے پاس آ کر بتایا کہ بڑے ابا کے بہت سے جاننے والے حضرات ان کا حال دریافت کرنے تشریف لائے تھے۔ ملازم کی بات سنتے ہی جیسے مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے گاڑی پورچ میں لے جا کر کھڑی کی اور سیدھا پہلے اپنے کمرے میں پہنچا' دن بھر کے سفر کی تھکان اتارنے کے لیے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے پہلے باتھ لیا اور پھر لباس تبدیل کرنے کے بعد میں بڑے ابا کے کمرے کی جانب بڑھا جہاں ان کی عیادت کو آئے ان کے دوست احباب جمع تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر میں نے سب کو سلام کیا تو بڑے ابا مجھے دیکھتے ہی اپنے پاس بلانے لگے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ بڑے ابا کی عیادت کو انہی کی عمر کے بزرگ حضرات آئے ہوں گے لیکن وہاں تو بچے' بوڑھے' جوان سبھی جمع تھے اور چند بچوں کو تو انہوں نے اپنے ساتھ بستر پر بھی بٹھا رکھا تھا۔ کسی نے بڑے ابا کے پاس سے اٹھ کر مجھے جگہ دی تو میں ان کے قریب جا بیٹھا۔ وہ مجھے اپنے دوست احباب یار بیلیوں کے درمیان بیٹھے بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے لیکن پھر بات کرتے کرتے بیچ میں ہی وہ ایک دم سے خاموش ہو جاتے اور وہاں بیٹھے سبھی حضرات بھی خاموشی سے جیسے پھر سے ان کے سلسلہ کلام کے آغاز کا انتظار کرنے لگتے لیکن بڑے ابا کے کرب کو فقط میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ انہیں جب مرزا چچا کا خیال آ جاتا تو وہ ایک دم سے جیسے مضطرب ہو جاتے اور میں سوچنے لگا کہ آج جو میں چچا مرزا سے مل کر آ رہا تھا تو ہو سکتا ہے' میرے وہاں سے پلٹ آنے کے بعد ہی انہیں احساس ہو جائے کہ بڑے ابا کی طبیعت جو اس قدر ناساز ہے تو وہ اپنے خاندان کو لے کر ان کی عیادت کو چلے آئیں لیکن پھر اگلے دو روز بھی بیت گئے اور میرا یہ خیال جیسے خیال ہی ثابت ہوا۔

تیسرے روز جو میں بڑے ابا کے سرہانے بیٹھا انہیں دوا کھلا رہا تھا' تو ماں اور یومنہ کمرے میں داخل ہوئیں' انہیں اچانک دیکھ کر میں خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یوں لگا یومنہ کے پیچھے ہی چچا مرزا' چچی ان کے صاحبزادے فرزند اور دلدار بھی آ رہے ہوں گے لیکن پھر یہ سن کر مجھے مایوسی ہوئی کہ فقط یومنہ اکیلی ہی آئی تھی۔ وہ بڑے ابا کے پاس بیٹھ گئی اور میں کچھ وقت کے لیے باہر چلا گیا اور جب میں دوبارہ کمرے میں لوٹا تو یومنہ بڑے ابا سے واپس جانے کے لیے اجازت لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موجود نمی بتا رہی تھی کہ وہ بڑے ابا کے پاس بیٹھی روتی رہی تھی۔ اب وہ بڑے ابا کے پاس اکیلی ہی موجود تھی' ماں بھی میرے جانے کے بعد شاید کمرے سے چلی گئی تھیں۔ بڑے ابا مجھے کہنے لگے کہ میں یومنہ کو باہر تک چھوڑ آؤں تو میں یومنہ کے ساتھ باہر کی جانب بڑھا' باہر نکلتے ہی یومنہ مجھے بتانے لگی کہ اس روز میرے گاؤں سے چلے آنے کے بعد ان کے گھر کے سبھی افراد جمع تھے جب اس کی ماں نے مرزا سے بات کی کہ انہوں نے طٰہٰ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا' انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا وہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ فقط یہ تھا کہ ابا کی جو صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی تو وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا' لیکن یومنہ نے نہایت افسوس کے ساتھ بتایا کہ چچا نے اس کے جواب میں بھی نہایت تلخ باتیں کی تھیں۔ ماں نے بالآخر انہیں بڑے ابا کی عیادت کے لیے راضی کرنا چاہا لیکن وہ نہیں مانے۔ اگلے ہی روز اسے واپس آنٹی اور انکل کے گھر آنا تھا اور جب وہ اپنی آنٹی اور انکل کے ہاں چلی آئی تو ان کی منت سماجت کے بعد اسے بڑے ابا کی طرف آنے کی اجازت مل گئی تھی پھر جو ایک اور بات

مجھے اس سے معلوم پڑی اس کا کچھ اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا' وہ بتانے لگی کہ وہ حیران تھی کہ یوں اچانک سے یہ انکل اور آنٹی کو اسے اپنے گھر لے جانے کا خیال کیسے آ گیا جبکہ انہیں وہ زندگی بھر میں فقط ایک دو بار ہی ملی تھی۔ تب جو اس نے ایک روز آنٹی سے اس سلسلے میں بات کی تو اس کی ضد پر آنٹی نے حقیقت اسے بتا ہی دی۔ دراصل چچا مرزا نے ہی انہیں بھیجا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ یومنہ ہماری طرف رہے۔ ہم لوگ اب بیرونی دروازے تک پہنچ چکے تھے لیکن یومنہ کے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہی اپنے دل میں اٹھتے ایک سوال کو میں نے اس کے سامنے کہہ ہی ڈالا۔ میں اس سے جاننا چاہتا تھا کہ جب میں نے اسے اپنی زندگی کا سارا سچ بیان کر ڈالا تو اسے پھر میرے ساتھ رشتے پر اعتراض کیوں نہیں۔

''نفرت انسان سے نہیں بلکہ اس سے سرزد ہوئے گناہ سے ہونی چاہیے۔'' وہ فقط اتنا کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور گاڑی لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کا جواب سن کر میرے چار سو جیسے کوئی دلجور آندھی چلنے لگی تھی۔ یہ وہی میرے اس سوال کا جواب تھا جو اس روز میں نے اسے ایک رقعے پر لکھ کر دیا تھا اور اب اس کی بات سن کر میں ایک بار پھر سے اپنے ماضی میں جا اترا تھا۔ ریوالور پھر سے میرے ہاتھ میں تھا اور پھر اگلے ہی لمحے کے کچھ حصے میں' میں نے اجمل پر گولی چلادی۔ خون کا ایک فوارہ اس کے سینے سے پھوٹ نکلا۔ میں اس کا مجرم بھی اس کے سامنے تھا' وہ قاتل بھی اس کے سامنے تھا جس نے ایک بے گناہ ہی نہیں بلکہ ایک معصوم انسان پر گولی چلادی اور وہ میرے ہی بہائے خون کی بوندوں سے معاف لکھتا رہا' وہ کس قدر عظیم تھا اور میں کس قدر حقیر...... اس نے مجھے معاف کر دیا کہ میں اپنے ہوش وحواس میں ہی نہ تھا نشے کی حالت میں تھا شاید ہوش وحواس میں ہوتا تو اس کی جان تو نہ لیتا۔ اس نے اپنی عظمت کا ثبوت دے دیا۔ ''نفرت انسان سے نہیں اس سے سرزد ہوئے گناہ سے ہونی چاہیے۔'' اس بات سے میں بابا رب نواز کے پاس انہی لمحوں میں پہنچ چکا تھا جب یہ بات انہوں نے میرے کان میں کہی تھی۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ اجمل نے مجھے معاف کیوں کیا' یہ جان کر مجھے اجمل کی ذات کی عظمت و بڑائی پر رشک آنے لگا۔ میں دو روز تک بابا رب نواز کے پاس ان کی خدمت میں ہی ٹھہرا رہا اور ان دو دنوں میں' میں نے ان کی صحبت میں ایسی ایسی نمازیں ادا کیں کہ جس سے میری زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی اور جب تیسرے روز مجھے بڑے ابا نے واپس چلنے کو کہا تو بڑے ابا کی واپس لوٹنے والی بات سن کر میں بے تاب ہو کر بابا رب نواز کے پاس دوزانو ہو کر جا بیٹھا۔ بڑے ابا جو مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں آ پہنچے تو انہوں نے بابا رب نواز سے بھی وہی بات کہہ ڈالی۔ بڑے ابا کی بات سن کر بابا رب نواز نے ایک نظر میری جانب دیکھا ان کے چہرے پر وہی ملکوتی مسکراہٹ سجی تھی۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے اپنے اوپر اوڑھی کالی چادر اتاری اور اسے میرے کاندھوں پر ڈال دیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میں اب اپنے بڑے ابا کی بات مان کر ان کے ہمراہ گھر واپس لوٹ جاؤں۔ وہ میرے دل کا حال سمجھ گئے تھے اور اب ان کی میرے کاندھے پہ ڈالی چادر میرے پاؤں کی بیڑی بن گئی تھی پھر میرے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی کیا تھا اور جب میں بے دلی کے ساتھ ان کے قدموں سے اٹھنے لگا تو جیسے انہیں مجھ پہ رحم آ گیا۔ ''میاں یہ چادر ہماری امانت ہے' جب اچھے ہو جاؤ تو اسے لوٹا جانا۔'' ان کے کہے یہ الفاظ سن کر میں جیسے کھل اٹھا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان کے کہے ان

الفاظ کا مطلب کیا تھا وقتی طور پر بڑے ابا کے ساتھ بھیجتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنے پاس لوٹ آنے کی دعوت بھی دے دی تھی۔ اسی خوشی سے سرشار میں بڑے ابا کے ساتھ گھر واپسی کے لیے چل پڑا۔ ہماری گاڑی گھر کی جانب رواں دواں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ جب میرے بے جان ہوتے وجود کو اسٹریچر پر ڈال کر اسی راستے سے لے جایا جارہا تھا تو گویا سبھی مایوس ہو چکے تھے اور میرے بچنے کی جیسے کوئی امید ہی باقی نہ تھی لیکن اب میں اپنے پورے ہوش وحواس میں بھلا چنگا گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ یہ اللہ کی قدرت کا ہی کرشمہ تو تھا اور بابا رب نواز بھی اللہ کی قدرت کا ایک ایسا ہی نایاب کرشمہ تھے، جنہیں اللہ نے علم عطا کر رکھا تھا جس سے وہ خلق خدا کی بھلائی کا کام لے رہے تھے۔ بڑے ابا نے چلتے وقت گھر اطلاع کردی تھی اور پھر راستہ بھر بڑے ابا کے موبائل پر کسی نہ کسی گھر کے فرد کی کال آتی رہی اور یہ سلسلہ ہمارے گھر پہنچنے تک جاری رہا۔ گھر پہنچ کر ایک اور ہی منظر میرا منتظر تھا' ابا نے میرے اچھے ہوجانے کی خوشی میں تب سے دیگیں چڑھائی شروع کردی تھیں جب ہم صبح بابا رب نواز کے در سے چلے تھے اور اب عصر کا وقت ہو رہا تھا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ میں گاڑی سے بغیر کسی کے سہارے اترا تو مجھے جیتا جاگتا اپنے پیروں پر کھڑا دیکھ کر سبھی خوشی سے آبدیدہ ہوگئے تھے۔ ماں اپنے جذبات پر قابو رکھ پائی تھی اور وہ رونے لگی۔ ابا' بھائی' عبدالقادر مجھے بار بار گلے لگاتے رہے اور میری پیشانی چوم لیتے تھے۔ انہیں ایسے آبدیدہ ہوتے دیکھ کر جیسے میں بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔

پھر مجھے لگا جیسے کوئی میرے عقب میں کھڑا میرے کاندھے کو چھوئے مجھے ہلا رہا تھا۔ میں نے جو مڑ کر دیکھا تو بابا عبدالقادر میرے عقب میں کھڑے تھے۔

''صاحب بی بی جی تو کافی دیر سے چلی گئیں آپ اندر آجائیں۔'' یومنہ جاچکی تھی اور اس کی بات سن کر میں خیالوں ہی خیالوں میں کہیں دور جانکلا تھا۔ جب بابا عبدالقادر کی بات سن کر میں خیالوں سے پلٹا۔ میں وہاں سے سیدھا اپنے کمرے کی جانب بڑھا اور کمرے کی تنہائی اور ملگجی روشنی میں' میں ایک بار پھر سے اپنے ماضی کے بیتے ان تلخ دنوں کو یاد کرنے لگا تھا۔ میری خطائیں کس قدر بڑی تھیں کسی رعایت' معافی یا بخشش کے لائق میں کب تھا' لیکن پھر اس رب سوہنے کی عطائیں بھی کس قدر عظیم تھیں' ہماری خطاؤں' ہمارے گناہوں' ہماری لغزشوں کی فہرست چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو' احساس ندامت کے بہائے ایک آنسو کی قیمت اس کی بارگاہ میں سارے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ میں اب جائے نماز پر سجدے میں گرا بلک رہا تھا' گڑگڑا رہا تھا' اس لیے نہیں کہ میری خطاؤں کی فہرست بہت طویل تھی بلکہ اس لیے کہ اس کی عطاء کی حدیں بہت وسیع تھیں۔

اس رات بڑے ابا کی طبیعت اچانک ہی پھر سے بگڑ گئی اور ہمیں ان کو لے کر اسپتال جانا پڑا۔ ان کی نازک حالت کے پیش نظر انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تھا اور ہم سبھی پر جیسے پھر سے غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ جب ہم انہیں لے کر اسپتال پہنچے تو وہ اپنے ہوش وحواس میں نہ تھے۔ رات دیر کو جو انہیں ہوش آیا تو انہوں نے میرے ابا کو اپنے پاس بلایا اور انہیں کہنے لگے کہ وہ اسپتال کے اس وارڈ میں رہ کر مرنا نہیں چاہتے' لیکن ابا ایسی حالت میں انہیں گھر کیسے لے جاسکتے تھے۔ انہیں تسلی دیتے رہے کہ وہ بہت جلد اچھے ہوجائیں گے لیکن وہ کسی کی بات ماننے

کو ہی نہ آتے تھے۔ اگلے روز جو ذرا سی ان کی طبیعت سنبھلی تو لامحالہ ابا کو انہیں لے کر گھر آنا ہی پڑا' پھر انہوں نے بڑے ابا کے لیے باقاعدہ ڈاکٹر اور نرس کی خدمات گھر پر ہی لے لیں اور میری یہ حالت تھی کہ میں بڑے ابا کے کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ لگا رہتا' میری ہمت ہی نہ پڑتی کہ میں اندر جا کر انہیں ایسی حالت میں دیکھ سکوں۔ میں دل ہی دل میں ان کے لیے دعائیں کرتا رہتا' یونہی ایک روز میرے ذہن میں بابا رب نواز کا خیال آیا۔ یہ خیال آتے ہی جیسے مجھے کچھ راحت کا احساس ہوا میری امید جاگی اور میں اسی لمحے گاڑی لے کر بابا رب نواز سے ملنے چل پڑا۔ سوچا انہیں جا کر ساری صورت حال سے آگاہ کروں گا۔ چچا مرزا کے انکار سے لے کر بڑے ابا کی روز بروز گرتی صحت تک سبھی کچھ بیان کروں گا اور پھر ان سے بڑے ابا کی صحت کے لیے دعا کرنے کی التجا کروں گا اور اگر وہ راضی ہوئے تو انہیں اپنے ساتھ گھر لے آؤں گا' کہ ان کے قدم رنجہ ہونے سے بڑے ابا پر آئی بپتا ٹل جائے۔ چار سے پانچ گھنٹوں کی طویل مسافت طے کر کے جو میں اپنی منزل مقصود تک پہنچا تو وہاں پہنچ کر مجھے یہ جان کر شدید صدمہ پہنچا کہ بابا رب نواز وہاں نہ تھے اور وہاں موجود ان کے شاگرد بھی یہ نہ جانتے تھے کہ وہ اچانک کہاں چلے گئے تھے۔ بابا رب نواز کے ایک خاص خادم سے مل کر جسے میں اچھی طرح سے جانتا تھا' میں نے اسے اپنا پیغام دیا کہ جب بابا رب نواز لوٹ آئیں تو وہ انہیں میرا یہ پیغام دینا ہرگز نہ بھولے کہ طٰہٰ بڑی مشکل میں ہے۔ میں اتنا کہہ کر پھر مزید وہاں نہ ٹھہرا اور واپسی کے لیے نکل پڑا۔ راستہ بھر مجھے رہ رہ کر بڑے ابا کا خیال ستاتا رہا' بابا رب نواز کا خیال آتے ہی میرے من میں ایک امید بیدار ہوئی تھی' پھر ان سے بھی ملاقات نہ ہوسکی' جانے رب کو کیا منظور تھا۔ میں نصف سے زیادہ کا سفر طے کر چکا تھا جب میرے فون پر بھائی کی کال آئی' اس نے مجھے جلد سے جلد گھر پہنچنے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور میرے اس کی یہ بات سن کر جیسے ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے' میں نے پھر گاڑی کی ریس سے پیر اسی وقت ہٹایا جب میں اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے میں سیدھا بڑے ابا کے کمرے میں پہنچا' گھر کے سبھی لوگ بڑے ابا کے بستر پر جھکے کھڑے تھے۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر میرے ابا تر آنکھوں سے میری طرف بڑھے اور میرا ہاتھ تھام کر انہوں نے مجھے بڑے ابا کے عین سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

''لیں اباجی طٰہٰ آ گیا ہے۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی زبان کانپ رہی تھی۔ بڑے ابا نے میری جانب اک نظر اٹھا کر دیکھا اپنا کپکپاتا ہاتھ اٹھانا چاہا میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کا ہاتھ تھام لیا' اگلے ہی پل ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں بے جان ہو کر بھاری ہو گیا۔ انکی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی اور میرے چار سو کھڑے گھر کی سبھی لوگ رونے چلانے لگے۔ وہ جن کے دیکھے بنا میری صبح نہ ہوتی تھی' وہ جن کے پیر دابے بنا میں سوتا نہ تھا وہ جن کی گود میں کھیلتے میرا بچپن گزرا تھا وہ جنہوں نے ایک نہیں دو دو بار مجھے موت کے منہ سے نکالا تھا' وہ میرے بڑے ابا اب...... نہیں رہے تھے۔ سبھی رو رہے تھے اور میں جیسے پتھر کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ پھر مسجد میں بڑے ابا کے جنازے کا اعلان ہوا' انہیں غسل دیا گیا اور کفن پہنا کر گلاب کے ہاروں سے سجا کر عطر لگا کر چارپائی کو صحن میں رکھ دیا گیا' لیکن میں پتھر کا مجسمہ ہی بنا رہا' ماں' ابا' بھائی' بھابی سبھی مجھے رلانے کی سعی کرتے رہے لیکن میں رو نہ سکا۔

ماں چلائی ''طٰہٰ تیرے بڑے ابا کو لے جا رہے

ہیں روک لے بیٹا' لوگ انہیں لے جارہے ہیں۔''
ماں کی یہ بات سن کر میں تب بھی نہ رویا بلکہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جنازے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے بھی بڑے ابا کے جنازے کو کاندھا دیا۔ اگلے روز صحن کے وسط میں بچھی چٹائیوں پر بیٹھے لوگوں کے پاس ہی ایک طرف میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میرا دل تھا کہ جیسے سینے میں سلگتا پھٹا جارہا تھا لیکن میں پتھر کا مجسمہ بنا بیٹھا رہا اور میرا سر بدستور جھکا ہوا تھا جیسے میں زمین میں گھڑے جارہا تھا۔ دفعتاً میری ناک کے نتھنوں سے وہی جانی پہچانی سی لاہوتی خوشبو ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے دروازے سے بابا رب نواز اندر داخل ہو کر اب میری جانب ہی بڑھے چلے آرہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی جیسے پھر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور اس قدر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ سبھی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میری جانب دیکھنے لگے تھے۔ بابا رب نواز نے پاس آ کر میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور پھر مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔ ان کے سینے سے لگ کر میں روتا ہی چلا گیا۔
دیر کردی...... بڑی دیر کردی...... میرے بڑے ابا...... دیر کردی بابا۔'' وہ مجھے جتنا چپ کراتے میں اتنا ہی رونے لگتا' زخم تو عمر بھر کا تھا پھر رو دھو کر میں خاموش ہوگیا۔ عصر کی نماز کے بعد میں بابا رب نواز کو بڑے ابا کی قبر پر لے گیا اور ان کے ساتھ بڑے ابا کی مغفرت کے لیے دعا کی وہاں ایک بار پھر میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور وہاں بھی بابا رب نواز نے مجھے اپنے کاندھے کا سہارا دیئے رکھا۔
وہ اگلے روز تک ہماری طرف ہی ٹھہرے اور جانے سے پہلے وہ مجھے تنہائی میں ملے۔
''طہٰ میاں میں نہ کہتا تھا کہ آجاؤ...... میرے پاس چلے آؤ چھوڑ دو اس دنیا کو جو تمہیں اتنے دکھ اتنے گھاؤ دیتی چلی جارہی ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں بنتا' یہاں سب اپنے سواد کے لیے جیتے ہیں۔ ان کے درمیان رہو گے تو انہی کی طرح کا بننا پڑے گا اور انہی کی طرح کا بنو گے تو وہی دکھ' تکلیفیں اور گھاؤ تو پھر تمہارا مقدر بنیں گے۔ میں تو کہتا ہوں اب بھی زیادہ وقت نہیں بیتا چھوڑو اسے اور میرے ساتھ چلو' تمہارے پاس سوچنے کے لیے دو روز ہیں دو روز تک میں واپس آؤں گا اگر ساتھ چلنا ہو تو اپنا سامان سفر باندھ کر رکھنا۔'' بابا رب نواز اتنا کہہ کر چلے گئے اور ان کے جانے کے چند لمحوں بعد ہی میں نے اپنا سامان سفر باندھنا شروع کردیا۔ سچ ہی تو کہا تھا بابا رب نواز نے یہاں کوئی کسی کا نہیں بنتا اور اگر ان لوگوں کے بیچ میں رہنا ہے تو انہی کے جیسا بننا پڑے گا۔
چچا مرزا آئے بھی تھے اگر تو اس وقت جب ان کے آنے کا کوئی فائدہ ہی نہ تھا۔ یہاں سب اپنے سواد کے لیے جیتے ہیں۔ میں نے بابا رب نواز کے کہے الفاظ کو دہرایا اور میرا سر نفی میں ہلنے لگا۔ میں ان کے جیسا نہیں بننا چاہتا' میں ان لوگوں کے بیچ نہیں رہنا چاہتا' پھر مجھے یومنہ کا خیال آنے لگا' میں سوچنے لگا کہ میرے چلے جانے سے اس کا بھی بھلا ہی ہوگا۔ اسے ضرور کوئی ایسا انسان ملے گا جو اسے ہر طرح کی خوشیاں دے سکے گا۔ میں اسے کیا دے سکتا ہوں جس کی اپنی گود کانٹوں سے بھری ہو وہ دوسروں کو پھول کہاں سے دے سکتا ہے' ایسا سوچتے ہوئے جیسے میں اپنے عزم اور ارادے کو اور بھی پختہ بنا رہا تھا۔
دو روز کے بعد جب بابا رب نواز لوٹے تو بڑے ابا کے لیے فاتحہ خوانی کے بعد میں ان کے ہمراہ جانے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا اور سبھی سے جب میں آخری بار الوداعی ملاقات کررہا تھا تو کسی نے مجھے

روکنا بھی نہیں چاہا۔ بڑے ابا کے گزر جانے کے بعد بابا رب نواز سے میری عقیدت کو دیکھتے ہوئے پھر کسی نے مجھے نہ روکا۔ بابا رب نواز نے مجھے بتایا کہ ہم اسی شہر سے ٹرین پکڑیں گے اور اپنی منزل کی طرف نکل پڑیں گے۔ وہ منزل کہاں ہے اور ہمیں جانا کہاں تھا یہ بات انہوں نے مجھے نہیں بتائی تھی۔ مائیکل ہمیں اسٹیشن تک چھوڑنے آیا اور پھر جاتے ہوئے جیسے وہ آبدیدہ سا ہو گیا تھا۔ مائیکل کو گھر روانہ کر کے میں نے اپنا اور بابا رب نواز کا سامان اٹھا کر ٹرین میں اپنی نشست کے پاس ہی احتیاط سے رکھا اور پھر بابا رب نواز کے ساتھ کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا میں گاڑی کے چلنے کا انتظار کرنے لگا۔ پلیٹ فارم پر حسب معمول بہت بھیڑ بھاڑ دکھائی دے رہی تھی۔ اسی بھیڑ بھاڑ میں مجھے سامنے وہ بینچ دکھائی دیا جس پر بیٹھے ہوئے میں نے یومنہ کو اپنی زندگی کی داستان سنائی تھی۔ ٹرین کی پہلی سیٹی بجی۔ مسافر سرعت سے ٹرین میں سوار ہونے لگے۔ الوداعی ملاقات کے لیے آئے لوگوں کے چہروں پر جہاں اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم تھا وہیں دوبارہ آ ملنے کی خوشی بھی نمی بن کر جھلک رہی تھی۔ دوسری اور تیسری سیٹی کے ساتھ ہی ٹرین نے جھٹکے کے ساتھ پلیٹ فارم کو چھوڑا اور دھیرے دھیرے سرکتے ہوئے آگے کو بڑھنے لگی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اپنوں کے ساتھ میرا شہر بھی مجھ سے بچھڑ رہا ہو۔ چند ہی منٹوں میں ٹرین نے اپنی رفتار پکڑ لی تھی۔ اب میرا شہر بھی مجھ سے کوسوں دور پیچھے رہ گیا تھا اور ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں کئی چھوٹے اسٹیشن اور پلیٹ فارم آئے جن پر چند منٹوں کے لیے گاڑی رکتی اور پھر سے مسافروں کو لیے اگلے پڑاؤ کے لیے چل پڑتی۔ ٹرین کو اب چلے ہوئے ڈھائی تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ ''اگلا اسٹیشن جہانیاں آباد ہی ہے ناں۔'' اچانک سے میرے بالکل سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا۔ مجھے چپ چاپ حیرت زدہ سا پا کر بابا رب نواز نے جواب دیا کہ وہ صاحب صحیح کہہ رہے ہیں۔ اگلا اسٹیشن جہانیاں آباد ہی ہے۔ یہ سنتے ہی جیسے ایک بار پھر سے مجھے یومنہ کا خیال آنے لگا۔ ''آپ پوچھیں گے نہیں طٰہٰ آج اس گھر سے جاتے ہوئے میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا کیوں پہن رکھا ہے۔ طٰہٰ میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ مجھے اس گھر میں آ کر کیا حاصل ہوا اور میں جو اس گھر میں فقط چند روز ہی گزار کر یہاں سے جا رہی ہوں تو میں اس گھر سے کیا لے کر جا رہی ہوں۔ میں آپ کے آنگن سے شرم وحیاء کا حجاب لے کر جا رہی ہوں۔ آپ سے مل کر میں نے زندگی کا اصل مقصد پا لیا ہے۔'' کیا میں اس قابل تھا کہ کوئی مجھ جیسے سے مل کر اتنا کہہ دے کہ آپ سے مل کر میں نے اپنی زندگی کا اصل مقصد پا لیا ہے۔ میں یونہی خیالوں میں گم صم بیٹھا تھا' جب بابا رب نواز مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''طٰہٰ میاں وہ رب سوہنا انسان کو کئی طرح سے آزماتا ہے۔ کبھی روپیہ پیسہ آزمائش بن جاتا ہے' تو کبھی اولاد آزمائش بن جاتی ہے۔ کبھی وہ ہم سے صحت وتندرستی لے کر ہم پر بیماری بھیج دیتا ہے' تو کبھی ہم سے ہمارا کوئی اپنا پیارا چھین لیتا ہے۔ جو کوئی ان کڑی آزمائشوں پر پورا اترتا ہے تو پھر وہ ہماری نیتوں کو دیکھتا ہے' اگر ہم نے سچے دل سے اسے رب مانا تو یقیناً ہم اسے اپنے مال اولاد صحت وتندرستی سے زیادہ بڑھ کر جانیں گے اور تب اس کی رحمت کی جو برسات ہوتی ہے تو ایسا جل تھل ہو جاتا ہے کہ پھر انسان اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔'' بابا رب نواز کی یہ باتیں سن کر میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے اپنی تعلیم

کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کی آخری بات کے ساتھ ہی ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ جہانیاں آباد کے اسٹیشن پر جا رکی۔

''طٰہٰ میاں تمہاری آزمائش فقط جہانیاں آباد کے اس اسٹیشن تک کی ہی تھی۔ بابا رب نواز کی یہ بات سنتے ہی میں نے حیرت سے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو میاں چلو نیچے اترو، مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے ٹرین کے ڈبے سے نیچے لے گئے۔ ٹرین کے ڈبے سے اترتے ہوئے میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، لیکن کسی انجانے احساس سے میرے دل کی دھڑکن جیسے بے قابو ہو رہی تھی۔ جہانیاں آباد کے چھوٹے سے پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ نیچے اترتے ہی میری نظر سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے چچا مرزا پر پڑی، میں نے یوں پلٹ کر حیرت سے ایک بار پھر بابا رب نواز کی طرف دیکھا۔

وہ میرا ہاتھ یوں مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے جیسے انہیں ڈر ہو کہ میں ان کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ نہ جاؤں۔ انہوں نے چچا مرزا کے پاس پہنچ کر میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چچا مرزا کے چہرے کی جانب جو میری نگاہ اٹھی تو ان کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھ کر بے ساختہ میں ان سے لپٹ کر رونے لگا۔ ان کے عقب میں میری نگاہ چچی پر پڑی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھا تو وہ بھی اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائی تھی۔ بابا رب نواز نے آگے بڑھ کر یومنہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اپنے گلے سے لگا لیا پھر فرزند اور دلدار بھی مجھ سے گلے مل کر بڑے ابا کو یاد کر کے روتے رہے۔

ٹرین نے پہلی سیٹی بجائی بابا رب نواز نے چچا مرزا سے مل کر اجازت چاہی اور پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔

''میاں تمہارے نکاح پر تو ہم نہیں آ پائیں گے، ہماری طرف سے یہ ایک ادنیٰ سا تحفہ قبول کرو۔'' مجھے ساتھ لیے ڈبے سے اترتے ہوئے انہوں نے ایک ہاتھ میں ایک بیگ بھی اٹھا رکھا تھا۔ وہ بیگ انہوں نے میری طرف بڑھا دیا۔ ٹرین اب دھیرے دھیرے پلیٹ فارم چھوڑ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر میرے لیے بابا رب نواز سے بچھڑنا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ رکنے والے نہ تھے۔ انہیں جب مجھ سے بچھڑنا ہوتا تھا وہ مجھے اپنی کوئی نہ کوئی نشانی دے دیا کرتے تھے اور ابھی چند ثانیے پہلے وہ ایسا کر چکے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دے کر آگے کو رینگتی ٹرین پر سوار کیا تو وہ انہیں لے کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے ہاتھ میں ان کے تحفتاً دیئے بیگ کی جوزپ کھولی تو اس میں وہی کالی چادر تھی جس کی لاہوتی خوشبو مجھے مسحور کیے رکھتی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا چچا کا پورا خاندان بابا رب نواز کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہا تھا، یہ دیکھ کر مجھے بابا رب نواز کے کہے وہ آخری کلمات یاد آ رہے تھے۔

''اس کی رحمت کی جو برسات ہوتی ہے تو ایسا جل تھل ہو جاتا ہے کہ پھر انسان اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔''

